سورۃ فتح

کی حکیمانہ انقلابی تفسیر

مقدمہ

ضبط کی ضرورت :

قرآن حکیم کل قومی پیمانے پر انقلابی تحریک پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کا ایک نصب العین یا مرکزی فکر ہے۔ وہ اس فکر کو ایک جماعت کی مکمل تیاری کے ذریعے سے انسانی سوسائٹی کے ایک حصے اور ملک کے ایک خطے میں خاص شکل میں قائم کرنا چاہتا ہے مگر ظاہر ہے کہ کوئی جماعت ضبط (Discipline) کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اور جتنا بڑا انقلاب ہوا اتنے ہی زبردست ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسلامی جماعت میں ضبط

جو جماعت بہت سخت ضبط کی مالک ہوتی ہے وہ صلح اور جنگ میں اپنی مرکزی جماعت کے فیصلے کی پوری پوری فرمانبرداری کرتی ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے جو جماعت پیدا کی وہ جنگ میں ضبط کے مظاہرے کئی بار کر چکی۔ صلح کرنے میں ضبط کے بہترین مظاہرے کا موقعہ حدیبیہ میں پیش آیا۔ جب آنحضرت ﷺ نے کمزور دشمن کے بدترین شرطیں صرف اس لئے مان لیں کہ وہ بنیادی طور پر ان اصولوں کی حفاظت چاہتا تھا، جن کی حفاظت کے لئے یہ انقلاب برپا کیا جارہا تھا یعنی دین حنیفی کے مرکز کعبہ اللہ کا احترام۔ آپ کی جماعت نے اس اصول کو پوری طرح سے سمجھتے ہوئے بھی اس صلح کو صرف اس لئے مان لیا کہ وہ ایک زبردست ضبط میں آئی ہوئی تھی۔ اس ضبط کی انتہا یہ تھی کہ جب آپ ﷺ نے اس جماعت سے موت پر بیعت لینی چاہی تو ہر ایک شخص نے ٹھنڈے دل کے ساتھ یہ سمجھ کر بیعت کی کہ یہ موت یقینی ہے اور جو شخص بھی اس وعدے کو توڑے گا اسے ضبط توڑنے کی بڑی سے بڑی سزا مل سکتی ہے۔

اس ضبط کا مقصد :

اس اونچے پیمانے کا ضبط پیدا کرنے کا مقصود کیا ہے؟ اس سورت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم اس ضبط کو سرمایہ شکن بین الاقوامی انقلاب پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے تاکہ خدا پرستی قائم ہو۔

انقلاب کی طبعی رفتار :

اس بات کو کھول کر بیان کیا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم کا انقلاب ایک مضبوط ضابطہ ہے جو جماعت کے ذریعے سے عمل میں آیا جس نے اپنا کام عرب میں شروع کیا تھا۔ انقلاب کی طبعی رفتار یہ تھی۔

(ا) ذاتی انقلاب (۲) محدود جماعت کی تیاری (۳) قومی انقلاب (۴) بین الاقوامی انقلاب

(ا) ذاتی انقلاب : کے متعلق قرآن حکیم کہتا ہے کہ :

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾

یعنی تو کہہ دے کہ میری بدنی اور مالی عبادتیں، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ ہی کے راستے میں ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

(ب) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (تحریم: ٦٦) اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

(۲) محدود جماعت کی تیاری : مکہ مکرمہ میں شروع ہوئی چنانچہ حکم آیا کہ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴿۲۱۴﴾ (اپنے قریبی قبیلہ والوں کو آنے والے انقلاب کی تنبیہہ کردو۔) (شعراء : ۲۱۴)

(۳) آنے والے قومی انقلاب کی طرف بہت سی آیات اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿۱﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾ (یوسف : ۱، ۲)

(۴) بین الاقوامی انقلاب کا بھی جو قرآنی تحریک کا معراج ہے بہت سی آیات میں ذکر موجود ہے۔ مثلاً اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۸۷﴾ (یہ قرآن تمام دنیا کی قوموں کے لئے یاددہانی ہے۔) (صٓ : ۸۷)

صلح حدیبیہ کا مقام تاریخ اسلام میں :

صلح حدیبیہ اس حیثیت سے تاریخ اسلام میں نقطہ تغیر (Turning Point) کا حکم رکھتی ہے کہ اب قرآنی انقلاب کی علمبردار جماعت انفرادی اور جماعتی انقلاب کی منزلیں طے کرنے کے بعد قومی انقلاب کی منزل بھی ختم کرنے والی تھی۔ اور ضبط اور تیاری کے سب سے اونچے نقطے پر پہنچ چکی تھی۔ اب اللہ کی حکمت چاہتی تھی کہ اسے بین الاقوامی میدان میں لائے چنانچہ سورہ فتح میں اس آنے والی تبدیلی کی پیشگوئی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰی قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ (الفتح : ۱۶)

(جو اعرابی اس سفر میں آپ کے ساتھ نہیں گئے اور پیچھے رہ گئے ان سے کہہ دیجئے کہ عنقریب تمہیں ایک شدید جنگجو قوم سے لڑنے کے لئے بلایا جائے گا۔)

اس آیت میں أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ (شدید جنگجو قوم) سے بقول امام ولی اللہ ایرانی اور رومی مراد ہیں۔ اسی کی طرف آگے چل کر ان الفاظ میں بھی اشارہ موجود ہے۔

وَّأُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا (الفتح:۲۱) (اور وہ مال غنیمت جس پر ابھی تم نے قدرت حاصل نہیں کی)

آنحضرتؐ نے حدیبیہ سے واپس آتے ہی محرم ۷ ھ میں عرب کے ارد گرد کے بڑے بڑے حکمرانوں کو اسلام کی طرف بلاوا بھیج دیا۔ یہ دعوت نامے کیا تھے آنے والے انقلاب کی تنبیہ تھے جو ان قوموں کو اپنے اندر ہضم کرنے والا تھا۔ چنانچہ قیصر روم کو تحریر فرمایا کہ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: من محمد عبداللہ و رسولہ الی ھرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الھدیٰ اما بعد فانی ادعوك بدعایة الاسلام اسلم تسلم یؤتك اللہ اجرك مرتین فان تولیت فان علیك اثم الیریسیین الخ

یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ خط محمد (ﷺ) کے جانب سے ہے جو اللہ کا بندہ اور اس کا ایلچی ہے۔ ہرقل شاہ روم کے نام، سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کا پیرو ہے۔ بعد حمد و صلوٰۃ، میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں تو اسلام قبول کرلے تو تمام آفتوں سے بچ رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر عطا فرمائے گا، اگر تو نے انکار کیا تو تمام دہقانوں اور کاشتکاروں کے گناہوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔

اور کسریٰ ایران کو لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: من محمد رسول اللہ اِلیٰ کسریٰ عظیم فارس سلام علی من اتبع الھدیٰ و امن باللہ و رسولہ و اشھد ان لاالہ الا اللہ و انی رسول اللہ الی الناس کافة لینذر من کان حیا اسلم تسلم فان ابیت فعلیك اثم المجوس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: یہ خط محمد (ﷺ) کی طرف سے، جو اللہ کے رسول ہیں کسریٰ شاہ ایران کی طرف۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی پوجا کے لائق نہیں ہے اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام دنیا کی قوموں کو اس کا پیغام پہنچانے کے لئے مقرر کیا گیا ہوں۔ تاکہ جو لوگ زندہ ہیں انہیں تنبیہ کر دی جائے۔ اسلام لے آ، تو بچ رہے گا اگر تو اسلام نہ لایا تو مجوس کے تمام گناہوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔

امام ولی اللہ کا فکر:

حضرت امام ولی اللہ دھلوی کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا ایک بہت بڑا مقصد ان دو سلطنتوں اور روئے زمین کے اسی قسم کے ظالمانہ نظاموں کو تباہ کرنا تھا کیونکہ خصوصاً ان دونوں بادشاہتوں میں معاشی عدم توازن انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ ایک چھوٹا سا امیر طبقہ دولت کی زیادتی کی وجہ سے عیاشیوں میں مبتلا ہو کر خدافراموشی کے سبب

سے عوام پر حد درجہ ظلم کرنے لگ گیا تھا اور عوام بھاری بھاری ٹیکسوں کے بوجھ تلے دب کر بیلوں اور گدھوں کے درجے میں آ چکے تھے۔ اور مرنے کے بعد کی زندگی کی بھلائی کے خیالات سے بالکل کورے ہو چکے تھے۔ (حجۃ اللہ البالغہ طبع مصر جلد اول ص ۱۰۵) آنحضرت ﷺ نے ان دو بادشاہوں کو جو خطوط ارسال فرمائے ان کی عبارت نہایت معنی خیز ہے اور اوپر بیان کی ہوئی باتوں کی طرف نہایت لطافت کے ساتھ اشارہ کرتی ہیں۔ دونوں میں عوام کی اخلاقی بربادی اور دوسری زندگی کی بھلائی سے محرومی کا ذمہ دار ان بادشاہوں کو قرار دیا گیا ہے چنانچہ ہرقل کے نام جو خط ہے اس میں ہے:

فان ابیت فان علیك اثم الیریسین

(اگر تو نے اسلامی انقلاب کو قبول نہ کیا تو تیرے ماتحت جو کاشتکار طبقہ تباہ ہو رہا ہے اس کے گناہوں کا یقینی طور پر تو ذمہ دار قرار دیا جائے گا)

ایسے ہی کسریٰ ایران کے نام جو گرامی نامہ ارسال فرمایا اس میں ہے:

فان ابیت فعلیك اثم المجوس

(اگر تو اسلامی انقلاب کے نیچے نہ آیا تو تیری ساری رعایا، مجوس کے گناہوں کا وبال، تیری گردن پر ہوگا) جیسے اوپر بتایا جاچکا ہے اب عرب کے انقلاب کی تحریک قومی حدوں سے باہر نکل کر اپنی تعلیم کی حقیقی روح کے پھیلنے کے لئے بین الاقوامی میدان تلاش کر رہی تھی۔ اس کا اشارہ کسریٰ کے خط میں موجود ہے جس کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

انی رسول اللہ الی الناس کافۃ

(میں اللہ کی طرف سے تمام دنیا کی قوموں کو پیام پہنچانے آیا ہوں)

آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں قرآن حکیم کے سرمایہ شکن بین الاقوامی انقلاب کو قومی پیمانے پر عرب میں بالکل کامیاب بنا کر دکھا دیا اور اس کے بین الاقوامی پھیلاؤ کے لئے جن قوتوں کی ضرورت تھی انہیں جگا کر اس انقلابی جماعت کے نیچے کر دیا اور ان دعوت ناموں کے ذریعے عرب کے ارد گرد کی سلطنتوں کو یہ انقلاب قبول کرنے کے لئے سوچنے کو کافی وقت دیا۔ اتنا کام کرنے کے بعد جو انتہائی کامیابی کا پوری طرح کفیل تھا آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ باقی کام آپ کی تیار کی ہوئی جماعت نے عین اس پروگرام کے مطابق پورا کر دیا، جس کی مدات (Items) آپ انہیں سکھا گئے تھے۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے سے شروع ہو کر حضرت عثمانؓ کے زمانے تک قرآنی انقلاب بین الاقوامی پیمانے پر اس طرح مضبوط ہو گیا کہ اس زمانے کی کوئی سیاسی طاقت اس کے مقابلے میں آنے کے قابل نہ رہی۔

سورہ فتح کا قیمتی سبق

اس سورت میں ہر زمانے کے سیاسی کام کرنے والوں کے لئے نہایت قیمتی سبق اور نہایت مفید رہنمائی ہے اور وہ یہ کہ جس زمانے میں قرآنی انقلاب ارتجاع (Reaction) کی نذر ہو جائے ایک جماعت پہلے اس علاقے میں کامیاب مرکز بنائے جس میں وہ بستی ہے اور پھر وہاں سے اس انقلاب کی شاخیں دوسری قوموں میں پہنچائے۔ اور ہر ایک قوم کے انقلابی اپنی اپنی جگہ اس کی کامیابی کی کوشش کریں۔ گویا اگرچہ اسلامی انقلاب اصل میں بین الاقوامی ہے، لیکن شروع ہی میں اسے عملاً بین الاقوامی پیمانے پر چلانا حکمت قرآنی کے خلاف ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ایک قوم کے اندر رہ کر ایسی جماعت تیار کی جائے جو تمام قوموں میں کام کرے اور تمام قوموں کو ایک ہی وقت اس قانون کے نیچے لانے کی کوشش کرے، چنانچہ امام ولی اللہ دھلوی لکھتے ہیں :

و هذا الامام الذی یجمع الامم علیٰ ملة واحدة یحتاج الی اصول اخریٰ غیر الاصول المذکورة فیما سبق منها ان یدعو قوما الی السنة الراشدة و یزکیهم و یصلح شانهم ثم یتخذهم بمنزلة جوارحه فیجا هدبهم اهل الارض و یفرقهم فی الافاق وهو قوله تعالیٰ۔ کنتم خیر امة اخرجت للناس و ذالك لان هٰذا الامام نفسه لا یتاتی منه مجاهدة امم غیر محصورة (حجۃ اللہ البالغہ مطبع مصر جلد اول ص ۱۱۸)

یعنی ”جو امام بین الاقوامی کام کے لئے مقرر ہو وہ اوپر بیان کئے ہوئے اصول پر کام کرے گا۔ مثلاً وہ ایک قوم کو زندگی گذارنے کے صحیح قاعدوں کی دعوت دے گا۔ اور انہیں پاک اور درست کر کے اپنا آلہ کار بنائے گا اور انہیں ساتھ لے کر دوسری قوموں سے لڑے گا اور انہیں مختلف قوموں میں بکھیر دے گا۔ چنانچہ قرآن حکیم کی اس آیت میں کنتم خیر امة اخرجت للناس (تم مسلم امت کا بہترین حصہ ہو جو تمام دنیا کی قوموں کے لئے چنے گئے ہو) کا یہی مطلب ہے۔ کام کرنے کا یہ طریق اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ ایسا امام تن تنہا ساری قوموں سے جہاد نہیں کر سکتا۔

موت قبول کرنے کی منزل

اس سورت میں اس حقیقت پر بھی پوری روشنی ڈالی گئی ہے کہ قرآنی تحریک میں ایک منزل آسکتی ہے جب اسے آگے بڑھانے کے لئے موت قبول کرنی پڑے اور جیسے صلح حدیبیہ کی تفصیل سے معلوم ہو گا، موت قبول کرنے کی شکل اللہ کی راہ میں جنگ کرنا بھی ہو سکتی ہے۔

قرآن اجماعی جنگ کا قائل ہے :

اس سورۃ کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے کہ قرآن حکیم نہ صرف جنگ کا قائل ہے بلکہ جنگ

اجماعی (Total War) کا قائل ہے یعنی اس کے نزدیک ہر شخص جان و مال سے اس میں پورا پورا حصہ لے گا یہاں تک کہ بیمار، لولے، لنگڑے اور اندھے بھی اپنا اپنا حصہ ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی تحریک اگر جنگ کا انکار کرتی ہے تو اسے ہر شکل میں ناجائز سمجھے گی اور کامل طور پر اہنسا (عدم تشدد) پر کاربند ہو گی۔ اگر وہ جنگ کو جائز سمجھتی ہے تو وہ جنگ کو اجتماعی اور کلی حیثیت سے قبول کرے گی۔ اور اپنے ہر ایک ممبر کو اس کی پوری طاقت کے مطابق اس میں حصہ لینے کا ذمہ دار سمجھے گی۔ کوئی شخص بہانہ بنا کر اس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔

ہندوستان اس وقت ایک زبردست لادینی سرمایہ پرست نظام کے نیچے ہے جس کی وجہ سے اس کے چالیس کروڑ آبادی میں سے چند مالداروں کو مستثنیٰ کر کے باقی ساری آبادی بھوکی یا آدھی بھوکی زندگی بسر کر رہی ہے وہ طرح طرح کی کمزوریوں اور بیماریوں میں پھنسی ہوئی ہے اور جہالت میں مبتلا ہے۔ اسی لئے وہ اپنی انسانیت کو بھولی ہوئی ہے وہ نہ یہ جانتے ہیں کہ آپس میں ان کے کیا حق اور فرض ہیں اور نہ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے خالق (پیدا کرنے والے) کے ساتھ ان کے کیا تعلقات ہونے چاہئیں۔ سورہ فتح چاہتی ہے کہ ہندوستان کے اس بھول گھر میں ایسی جماعت پیدا کی جائے جو حجازی بین الاقوامی انقلاب لانے والی جماعت کی طرح انتہائی ضبط کی مالک ہو۔ اس کے ارکان اس سرمایہ پرستانہ نظام کو توڑنے کے لئے عدم تشدد کی پابندی کے ساتھ موت کو قبول کر کے پوری پوری اور انتہائی کوشش کریں اور فی الحال يَقْتُلُوْنَ (قتل کرنا) کو ملتوی رکھ کر يُقْتَلُوْنَ (قتل ہونا) کو قبول کریں۔[1] ان کی نظر بین الاقوامی ہو، وہ ہر ایک انسان کے ساتھ خدا تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا عدل کرنے کو تیار ہوں اور چالیس کروڑ کی مظلوم انسانیت کو سرمایہ پرستی اور اس کے پیدا کئے ہوئے معاشی ظلم سے نجات دلا کر اس کے لئے خدا کو پہچاننے کا راستہ آسان کر دیں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی نبیہ الکریم صاحب الانقلاب العظیم و علی الذین معہ اشداء علی الکفار الذین یفسدون الارتفاقات المعاشیۃ و الارتفاقات المعادیۃ۔ رحماء بینھم سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود

(آخری بات یہ ہے کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو سب قوموں کو پالنے والا ہے اور رحمتیں اور سلامتیاں ہوں اس نبی اعظم پر جو عالمگیر انقلاب کی دعوت دینے آیا اور اس کے ساتھیوں پر جو ان کافروں پر سخت ہیں، جو انسانی سوسائٹی کے معاشی ارتفاقات اور معادی ارتفاقات خراب کرتے ہیں۔ آپؐ کے ساتھی آپس میں بہت نرم اور رحم دل ہیں۔ ان کے چہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ کے حوالے کر کے اس کے آگے سجدہ کر رہے ہیں۔)

بشیر احمد لدھیانوی

---

[1] (اس آیت کے طرف اشارہ ہے يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۔ (وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پھر وہ قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں) (سورۃ توبہ: ۱۱۱)

قومی انقلاب

تمہید

سورۂ محمدؐ (یا قتال)، سورۂ فتح اور سورۂ حجرات نفس مضمون کے اعتبار سے ایک مرتب مجموعہ ہے، جس میں اسلامی انقلاب کی تنظیم پر بحث کی گئی ہے، جس کے لئے بیرونی حملوں سے بچاؤ، کل قومی پھیلاؤ اور اندرونی معاشرتی زندگی کی تنظیم کے قوانین دئے گئے ہیں۔

سورۂ محمد (یا قتال) ہجرت کے پہلے ہی سال جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی۔ اس میں آنے والی عربی جنگوں کی ضرورت کے پیش نظر میدان جنگ کے قوانین دیئے گئے ہیں۔

انیس سال کے تھوڑے عرصے میں یہ انقلابی جماعت ضبط اور نظم میں ترقی کرکے ایسی بے نظیر قوت ضبط کی مالک ہوگئی کہ وہ صلح اور جنگ میں ایک ہی نظریئے کے ماتحت کام کرنے کے قابل ہوگئی۔ یہ وہ حالت ہے جس میں اسے خدا تعالیٰ نے بین الاقوامی پھیلاؤ (Expansion) کے قابل سمجھا۔ چنانچہ سورۂ فتح میں جو حدیبیہ سے واپسی پر راستے میں اتری۔ اس انقلابی جماعت کی اس اعلیٰ درجے کی حالت کا نقشہ کھینچ کر لانے والی بین الاقوامی جنگوں کی خبر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان جنگوں میں اس جماعت کا نظریہ کیا ہونا چاہیے۔

سورۂ حجرات میں غیر مصافی قانون (Civil Laws) اور معاشرت کی چند دفعات سکھائی گئی ہیں۔

سورہ فتح کا مرکزی واقعہ

سورۂ فتح میں صلح حدیبیہ کے واقعات کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ ذی قعدہ ۶ ہجری میں حضرت نبی اکرم ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ گویا آپ اور مسلمان مکہ مکرمہ پہنچ گئے ہیں اور "بیت اللہ" کا طواف کر رہے ہیں۔ اس خواب کی کیفیت سن کر غریب الوطن مسلمان جو عرصے سے خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے بے تاب تھے اور بھی بے چین ہوگئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر آنحضرت ﷺ بھی عمرہ کے لئے جانے پر تیار

ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ اور آپ کی جماعت ذی قعدہ ۶ھ میں مدینہ منورہ سے نکلی۔

اس سفر میں آپ کے ساتھ پندرہ سو صحابہ تھے۔ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جن میں کچھ سوار تھے اور کچھ پیدل۔ جب آنحضرت ﷺ ذی الحلیفہ کے گاؤں پہنچے تو آپ نے عمرے کا احرام باندھا اور قبیلہ خزاعہ کے ایک آدمی کو بطور جاسوس بھیجا کہ قریش کی خبر لائے۔ چنانچہ جب آپ عسفان کے قریب پہنچے تو وہ سکاؤٹ واپس آیا اور اس نے خبر دی کہ قریش آپ کو روکنے اور آپ سے لڑنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔

جب حضرت نبی اکرم ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ: ہم کسی سے لڑنے کے لئے گھر سے نہیں نکلے، لیکن اگر کوئی ہمیں "بیت اللہ" (کعبہ) تک پہنچنے سے روکے گا، تو اس سے لڑیں گے۔ یہ سن کر حضرت نبی اکرم ﷺ آگے بڑھے اور کچھ دور جا کر آپ نے فرمایا کہ خالد بن ولید غمیم میں ہے ہم دائیں کو ہو چلیں۔ یہاں تک کہ آپ اپنی جماعت سمیت اس وادی تک پہنچ گئے، جہاں سے مکہ کو جاتے ہیں۔ یہاں آپ کی اونٹنی یکایک ٹھہر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر قریش مجھ سے کسی ایسی بات کا مطالبہ کریں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حرمات کی تعظیم ہوتی ہو تو میں ان کی بات مان لوں گا۔ آگے بڑھ کر آنحضرت ﷺ حدیبیہ کے مقام پر اترے یہاں سے مکہ صرف ۱۹ میل تھا۔

یہاں سے آپ نے حضرت عثمانؓ بن عفان کو سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا، تاکہ انہیں خبر دیں کہ مسلمان صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں، ساتھ ہی انہیں ہدایت کر دی کہ مکہ مکرمہ میں جو مسلمان چھپے چھپے رہتے ہیں، ان سے بھی ملیں۔ اور انہیں فتح کی خوشخبری دیں اور انہیں اطمینان دلا دیں کہ مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا اور کسی کو اپنا ایمان چھپانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ بلوح کے مقام پر قریش کی جماعت سے ملے اور پھر مکہ معظّمہ تشریف لے گئے۔

اس اثناء میں آنحضرت ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں پر اس خبر کا اثر پڑ سکنا ظاہر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے کیکر کے ایک درخت کے نیچے تمام حاضرین سے اس امر پر اقرار لیا کہ اگر اب لڑنا پڑے تو ثابت قدم رہیں گے۔ مسلمانوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ بیعت کی۔ سب سے پہلے حضرت ابو سنان الاسدی نے بیعت کی۔ ایک صحابی حضرت سلمہ بن اکوع نے تین مرتبہ بیعت کی یعنی شروع میں، بیچ میں اور آخر میں۔

یہ خبر سن کر قریش کے ہوش جاتے رہے اور انہوں نے صلح کے لئے آدمی بھیجے۔ آخر ان باتوں پر صلح ہو گئی۔

(۱) یہ صلح دس سالوں تک رہے گی۔

(۲) جو قبیلے قریش سے ملنا چاہیں، قریش سے مل جائیں اور جو مسلمانوں سے ملنا چاہیں مسلمانوں سے مل جائیں۔

(۳) مسلمان ابھی واپس جائیں اور اگلے سال کعبہ کا طواف کرلیں۔

(۴) اگر مکہ والوں میں سے کوئی شخص مسلمان ہو کر نبی اکرم ﷺ کے پاس چلا جائے، تو اسے قریش کے طلب کرنے پر واپس کردیا جائے اور اگر کوئی مسلمان قریش میں چلا گیا تو اسے واپس نہیں دیا جائے گا۔

اس شرط پر ابھی بحث ہو رہی تھی کہ مسلمان ابو جندلؓ بن سہیل مکہ سے آیا اور تمام مسلمانوں کے سامنے گر گیا۔ قریش کے سفیر نے معاہدے کی شرط کے مطابق اسے طلب کیا، حالانکہ ابھی اس شرط پر بحث ہو رہی تھی۔ اس آخری شرط سے سب مسلمان سوائے حضرت ابو بکرؓ کے سخت پریشان ہوئے۔ اس پریشانی کی ترجمانی حضرت عمرؓ نے کی۔ آپ نے حضرت نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ ”یارسول اللہ! کیا آپ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟“ آپ نے فرمایا ”یقینا میں اللہ کا نبی ہوں“۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ ”کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن ناحق پر نہیں ہیں؟“ آپ نے فرمایا ”یقیناً“۔ پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ ”کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم عنقریب بیت اللہ کا طواف کریں گے؟“ آپ نے فرمایا کہ ”کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی ہی سال کریں گے؟“ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ”نہیں“۔ تو آپ نے فرمایا کہ ”یقین رکھو ہم ضرور یہاں آئیں گے اور طواف کریں گے۔“

حضرت عمرؓ نے اسی قسم کی باتیں حضرت ابو بکرؓ سے بھی کیں۔ حضرت صدیق اکبر نے بھی وہی جوابات دیئے، جو آنحضرت نے دیئے تھے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ آنحضرت جو بات فرمائیں اسے مرتے دم تک بے چون وچرا مانتے رہو۔ غرض یہ شرط منظور ہوگئی اور آنحضرت ﷺ نے ابو جندلؓ کو قریش کے سفیر کے حوالے کردیا۔ اور ”ابو جندلؓ نے صبر کے ساتھ اپنی مصیبت کو قبول کرلیا۔ اور تمام مسلمان یہ تلخ گھونٹ پی کر بھی چپکے ہو رہے۔“

ابھی حضرت نبی اکرم ﷺ حدیبیہ ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ اسی (۸۰) آدمی کوہ نعیم سے صبح کے وقت اس ارادے سے اترے کہ مسلمانوں کو نماز کی حالت میں قتل کردیں۔ یہ سب لوگ گرفتار کرلئے گئے۔ لیکن آنحضرت نے انہیں معاف کرکے رہا کرادیا۔

اس معاہدے کے بعد آپ حدیبیہ سے مدینہ منورہ کو واپس تشریف لے گئے۔ راستے میں سورہ فتح کے شروع کی آیتیں اتریں۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝١ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝٢ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝٣

ترجمہ: ہم نے تجھے کھلی فتح دی اور تیری پہلی لغزشیں اور پچھلی لغزشیں معاف کردیں اور اپنی نعمت تجھ پر تمام کردی اور سیدھی راہ کی طرف تیری راہنمائی کی اور تجھے زبردست مدد دی۔

اس پر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا یہ فتح ہے؟ (یعنی حدیبیہ کا صلح نامہ) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہاں یہی چیز ہے جسے فتح قرار دیا گیا ہے۔

آپ مدینہ منورہ میں ذی الحجہ کے شروع میں واپس تشریف لے آئے۔ یہاں کوئی تین ہفتے ٹھہرے ہوں گے کہ محرم میں خیبر پر چڑھائی کردی۔ اس معرکے میں صرف ان مسلمانوں کو شامل ہونے کی اجازت تھی جو حدیبیہ کے واقعے میں شریک رہ چکے تھے۔

صلح کا نتیجہ اور اثر:

اس صلح کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں اور ان کے مخالفوں میں راہ و رسم بڑھا اور میل جول زیادہ ہوا، تو اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کے بادل چھٹنے لگے اور لوگ مسلمانوں کے اچھے سلوک سے اثر لے کر مسلمان ہونے لگے۔ آنحضرت ﷺ نے صلح نامہ کی چوتھی شرط کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ مخالفین میں سے جو شخص مسلمان ہوگا وہ شرط کے مطابق مخالف کیمپ میں بھیجا جائے گا، لیکن ضرور وہاں بھی اپنا کام کرتا رہے گا۔ چنانچہ حضرت ابو جندلؓ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے عین معاہدہ لکھے جانے کے وقت قریش کے حوالے کردئے گئے۔ انہیں مکہ معظّمہ لے جاکر قید کردیا گیا۔ لیکن جو شخص ان کی نگرانی پر مقرر ہوتا۔ وہ ان کے سمجھانے سے مسلمان ہوجاتا۔ اب دونوں مل کر تلقین کرتے۔ اس طرح ان قیدیوں کی تلقین سے تین سو کے قریب آدمی مسلمان ہوگئے۔ قریش مکہ نے بہتیرا چاہا کہ آنحضرت ﷺ معاہدے کی اس شرط کو توڑ کر ان مسلمانوں کو اپنے ہاں لے لیں۔ لیکن آپ نے معاہدہ توڑنا قبول نہیں فرمایا۔ آخر قریش کو خود ہی ان مسلمانوں کو مکے سے نکال دینا پڑا۔

حدیبیہ میں اسلامی جماعت کے ضبط کا حال اوپر بیان ہوچکا۔ یہ لوگ تو آنحضرتؐ کے سامنے تھے، لیکن حضرت ابو جندلؓ آپ سے دور ہوتے ہوئے بھی جماعتی ضبط کے اتنے پابند نکلے کہ جب مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے قرار دیا کہ ابو جندلؓ نے ابو العاص مکی کے جس قافلے کو لوٹا ہے اس کا مال اسے واپس کردیں، تو انہوں نے اس فیصلے کی اطلاع پاتے ہی ابو العاص کے قافلے کا سارا اسباب یہاں تک کہ رسی اور اونٹ کی مہار تک ابو العاص کے حوالے کردی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ابو العاص نے سارا مال حقداروں تک پہنچا کر اسلام قبول کرلیا۔

غرض اس صلح کے نتیجے کے طور پر لوگ کثرت سے اسلام لانے لگے۔ چنانچہ جہاں حدیبیہ کے واقعے میں آنحضرت کے ساتھ پندرہ سو آدمی تھے، وہاں ایک سال بیچ دے کر اگلے سال فتح مکہ کے وقت آپ کے ساتھ دس ہزار "قدوسی"[1] تھے۔ یہ نتیجہ تھا اس بات کا کہ اب مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کے بادل چھٹ رہے

---

[1] یہ تورات کا لفظ ہے دیکھو کتاب استثناء باب ۳۳ آیت ۲۔ (مرتب)

تھے۔ گویا اس صلح نے اسلام کی فتح کا دروازہ کھول دیا۔

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا (ہم نے تجھے کھلی فتح دی)

جو صلح فتح کی قائم مقام ہو، وہ جماعت کی مضبوط تنظیم پر موقوف ہوتی ہے۔

انقلاب کیا ہے؟ :

ایک استاد ایک نیا فکر لے کر اٹھتا ہے۔ خدا تعالیٰ اپنی مہربانی سے اسے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ اور کام کرنے کا صحیح طریقہ سمجھاتا ہے۔ وہ اس تعلیم ہی کے ذریعے سے ایک نظام پیدا کرلیتا ہے۔ جس سے وہ دنیا سے ہر قسم کا ظلم دور کرکے انسانوں کے تعلقات خدا کے ساتھ قائم کرنے کے موقعے بہم پہنچاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا مضبوط نظام جس میں ایک فرد اپنا سب کچھ اس نظام پر قربان کرنے کو تیار ہے، باطل پر غالب آجاتا ہے۔ یہی انقلاب ہے۔

مسلمانوں کی مضبوط پوزیشن :

اس وقت جب حدیبیہ کے مقام پر دونوں جماعتیں ملیں۔ دونوں کی کیا حالت تھی؟ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کا نظام نہایت مضبوط تھا۔ ان میں ضبط (Discipline) اور اطاعت (Obedience) انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس کے برخلاف اہل مکہ کمزور تھے، ان کے بڑے بڑے سردار مرچکے تھے۔ اور اب اہل مکہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ فوجی نقطہ نگاہ سے بھی مسلمانوں کی پوزیشن مضبوط تھی، کیونکہ وہ اچانک مکہ کے عین پاس پہنچ چکے تھے، ان باتوں کے ہوتے ہوئے جب مکہ والوں نے صلح پیش کی تو حضرت نبی اکرم ﷺ نے وہ شرطیں جھٹ مان لیں۔ رفتہ رفتہ عام مسلمانوں نے بھی انہیں قبول کرلیا۔ یہ قبولیت ان کے اندرونی نظام کی قوت کے سبب سے تھی۔ نہ اس لئے کہ سب مسلمان صلح کی حکمت کو سمجھ گئے تھے،اس صورت میں یہ صلح قیامت تک مسلمانوں کے لئے فخر کا سبب گنی جائے گی۔ اس سے جو فائدے نکلے انہوں نے مخالفوں کو بھی سمجھا دیا کہ اسلامی نظام میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور اس کے نیچے کیا کیا دانائیاں چھپی ہوئی ہیں۔

جنگوں کا نقصان :

اب تک اہل اسلام اور اہل مکہ کے درمیان جو جنگیں ہوئیں ان کی وجہ سے اہل مکہ ان فائدوں پر غور نہیں کرسکے تھے، جو اسلام کا انقلاب قبول کرنے سے حاصل ہوسکتے تھے۔ اس مطالعے کے لئے انہیں نہ وقت ملا تھا، نہ

آسانیاں حاصل ہوئی تھیں۔ اس صلح کے بعد ان لوگوں کا مسلمانوں کے ساتھ میل جول بڑھا۔ تو انہوں نے مسلمانوں کے مستقبل کو سوچنا شروع کیا اور انہیں وہ فائدے نظر آئے جو جنگ اور نفرت کے گرد و غبار میں سے نظر نہ آسکتے تھے۔ اب اچھے اچھے اہل مکہ اسلام لے آئے اور اس طرح قرآنی انقلاب کو ایسے کام کے آدمی مل گئے جنہوں نے آگے چل کر نہایت شاندار تعمیری کارنامے کیئے۔

صلح کا فائدہ :

یہاں ایک اور بات بھی سوچنے کے لائق ہے۔ اور وہ یہ کہ قریش مکہ عرب میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے، اگر ان کی اجتماعیت نہ ٹوٹتی اور کسی وجہ سے اپنے پہلے فکر سمیت اسلام میں داخل ہو جاتے تو اپنے قدیم (مشرکانہ) فکر پر نئی اجتماعیت پیدا کر کے اسلام کے اندر ایک مستقل کھینچا تانی کا باعث بنتے۔ لیکن اس صلح کے بعد انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ اسے عام انسانیت کے لئے مفید سمجھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے قدیم خیالات چھوڑ کر اسلام کا نظریہ لے لیا۔ اور اس کی مضبوطی کا سبب بنے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صلح کو فتح سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ

(تاکہ تیری پہلی لغزشیں اور پچھلی لغزشیں معاف کرے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو ان کی پہلی اور پچھلی غلطیوں کی معافی کی اطلاع دی جا رہی ہے، جو لوگ نبیوں کو عام طور پر اور آنحضرت ﷺ کو خاص طور پر معصوم[1] مانتے ہیں۔ (اور عقلی طور پر اس کے سوا چارہ نہیں کہ انہیں معصوم مانا جائے)۔ ان کے لئے دماغ میں چبھنے والا فکر ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتں

ہم اس "معافی" کے مسئلے کو اس طرح حل کرتے ہیں کہ حضرت نبی اکرم ﷺ قریش پر حملہ کرنے کے لئے آئے ہی نہیں۔ بلکہ ان کی کمی پوری کرنے اور تعلیم دینے کے لئے آئے ہیں۔ چنانچہ امام ولی اللہ دہلوی 'تفہیمات الٰہیہ' جلد اول ص : ۳۰۲ میں فرماتے ہیں کہ :

"واضح رہے کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت نبی اکرمؐ میں دو خصوصیتیں جمع ہو گئی ہیں۔

---

[1] جس سے کوئی غلطی نہ ہو سکتی ہو۔ (مرتب)

(۱) نبوت عامہ اور (۲) قریش کی سعادت کا سبب بننا۔

آپ کی نبوت میں مفہمیت❶ کی تمام قسمیں آگئی ہیں۔ اس سے ہر ایک رنگدار اور گوری قوم کو فیض پہنچتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب حکمت الٰہی کی مصلحت❷ کلی کا تقاضا ہوا کہ ترکوں کی سلطنت عام طور پر پھیل جائے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توجہ اسلام قبول کرنے کی طرف پھیر دی۔

باقی رہی قریش کی سعادت تو ان کی لمبی حکومت کی وجہ یہی سعادت تھی۔

میرا وجدان گواہی دیتا ہے کہ اگر کسی سیاسی انقلاب کا تقاضا یہ ہو کہ ہندوستان کے ہندو مستقل عمومی حکومت❸ پیدا کریں۔ تو یقیناً قانون الٰہی کا فیصلہ یہ ہوگا کہ ہندو لیڈر اسلام قبول کرلیں۔ جیسے ترکوں نے قبول کرلیا تھا۔ کیونکہ جناب نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی عمومیت اور آپ کے صاحب ملت ہونے کا یہی طبعی تقاضا ہے۔

حضرت نبی اکرم ﷺ کے کلام کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں کبھی تو آپ نبی ہونے کی حیثیت سے کلام فرماتے ہیں، کبھی اس حیثیت سے کہ آپ قریش کی سعادت کا ذریعہ ہیں۔"

اسی فکر کو حجۃ اللہ البالغہ (مطبوعہ مصر) جلد اول ص ۱۲۴ اور ص ۱۲۸ میں یوں ظاہر فرماتے ہیں:

"واضح رہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ ملت حنیفیت اسماعیلیہ میں پڑی ہوئی کجی کو ٹھیک کرنے اس کی بگڑی ہوئی شکل کو صاف کرنے اور اُس کا نور پھیلانے کے لئے تشریف لائے، جب حقیقت یہ ٹھہری تو لازم آیا کہ اس ملت کے اصول تو قائم رکھے جائیں اور اس کے طریقے نہ ہٹائے جائیں۔ کیونکہ جب نبی اپنی قوم کی طرف مقرر ہو کر آتا ہے تو اس قوم میں کچھ اچھے طور طریقے باقی ہوں تو وہ انہیں نہیں بدلتا۔ کیونکہ ان کو بدلنا بالکل بے معنی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت نبی اکرمؐ نے بھی ملت حنیفیہ اسماعیلیہ کی شریعت پر نظر ڈالی۔ تو جو چیز حجرت اسماعیلؑ کے اصل طریقے پر دیکھی اسے باقی رہنے دیا۔ اور جو چیز بدل چکی تھی اور جس میں فساد اور خرابی آچکی تھی اسے ہٹادیا۔ آپ نے ملت حنیفیہ کے اشاعت کی بے حد کوشش کی کہ یہ قانون تمام قوموں پر غالب آجائے اس سلسلے میں ملت حنیفیہ میں جو تحریفات❹ دیکھیں ان کو مٹادیا اور بڑے زور سے ان کی نفی کی۔ اور جو ارتفاقات❺ صحیح تھے، انہیں قائم رکھا۔ اور ان پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ ان میں جو خراب رسمیں آگئی تھیں ان سے روکا اور جبراً منع کیا اور اس ملت کے

---

❶ جسے خدا کی طرف سے کوئی بات سمجھائی جائے۔ اسے مفہم کہتے ہیں۔ امام صاحبؒ کے نزدیک اس کے کئی درجے ہیں۔ ان میں معمولی القاء سے لے کر صاف لفظ وحی تک سب آتے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھو حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۸۴

❷ سب انسانوں کو فائدہ پہنچانے والی چیز یا بات (مرتب)

❸ ایسی حکومت جس کی بنیاد قومیت کی جگہ انسانیت پر ہو۔ (مرتب)

❹ تبدیلیاں

❺ زندگی گذارنے کے طور طریقے

اصول پر بین الاقوامی حکومت قائم کی اور جو لوگ اس بارے میں آپ کے ساتھ شریک ہوئے ان کی مدد سے جنگیں بھی کیں۔ یہاں تک کہ مخالفین کی مخالفت دھری کی دھری رہ گئی اور خدا کا قانون سب قوموں پر چل کر رہا۔

اور خیر کثیر میں فرماتے ہیں کہ : ''حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کی طرح حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی پہلی حیثیت میں اپنی قوم کے لئے نبی بن کر آئے۔ جب اس پر ایک زمانہ گزر گیا تو آپ کی قوتیں چودھویں کے چاند کی جگہ سورج بن کر چمکنے لگیں۔ پھر ایک اور ترقی ہوئی کہ آپ کی شان کو پورا پورا کمال حاصل ہوا ، جس سے اوپر کوئی کمال نہیں ہے۔ اب آپ کرۂ زمین کے ہر ایک گوشے کے امام بنائے گئے۔'' آپ ﷺ کی ان دو حیثیتوں کی حکمت حجتہ اللہ البالغہ میں یوں بیان فرماتے ہیں۔ ''جو امام سب قوموں کو اپنی ملت پر جمع کرنے کے لئے اٹھتا ہے۔ وہ پہلے ایک قوم کو صحیح اصول کی دعوت دیتا ہے۔ انہیں غلط کاریوں سے پاک کرتا ہے، ان کی حالت درست کرتا ہے اور پھر انہیں اپنا آلہ کار بنا کر دنیا کی سب قوموں سے جنگ کرتا ہے اور اپنی قوم کے لوگوں کو سب قوموں کے اندر پھیلا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ کسی امام کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اکیلا سب قوموں سے جنگ کرتا پھرتا۔'' (جلد اول ص ۱۱۸)

اس اصول نے حضرت نبی اکرم ﷺ کی مبارک زندگی میں کس طرح کام کیا۔ اس کی تشریح آگے چل کر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

''مہاجرین اور انصار کی پہلی جماعت، قریش اور ان کے ارد گرد کے قبیلوں کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان عربوں کے ہاتھوں عراق اور شام فتح کرایا۔ کیونکہ ان علاقوں میں عرب عنصر موجود تھا۔ اسے اپنی اپنی قوم کے اندر عربی اسلامی انقلاب کے لئے تیار کیا گیا۔ پھر ان عراقیوں کے ہاتھوں ایران اور شامیوں کے ہاتھوں روم فتح کرائے (کیونکہ انہیں ان علاقوں کے باشندوں سے مناسبت تھی)۔ پھر ایرانیوں کی مدد سے ہندوستان اور ترکستان اور رومیوں کی مدد سے حبشہ وغیرہ کے علاقے فتح کرائے۔''

معلم منتقم نہیں ہو سکتا :

واقعہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل جو عرصے تک ابراہیمی دعوت کے حامل رہے۔ اس اونچے رتبے سے گر چکے ہیں، اور حکمت الٰہی قریش یعنی بنی اسماعیل کو اس دعوت کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اور اب وقت آگیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے جو دعا کی تھی : رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ (۱۲۹:۲) (یعنی اے ہمارے پروردگار! ہم نے جس امت مسلمہ کو اپنی نسل سے اٹھانے کی دعا کی ہے ان میں انہی میں سے ایک رسول

بھیج) وہ پوری ہو۔ قریش میں بھی اس دعوت کے اصل مدعا پر ایمان موجود تھا۔ وہ بھی سمجھتے تھے کہ ہمارا وجود ابراہیمی دعوت کے اظہار کے لئے کمال رکھتا ہے۔ مگر جہالتوں کے سبب وہ بہت سی غلط باتیں اختیار کر چکے تھے۔ ان غلطیوں کو دور کرنا، ان کے اخلاق سنوارنا، انہیں صحیح ابراہیمی طریقہ ذہن نشین کرانا، پھر اس کی حکمت اور حکمت کے اندر قانون سازی سکھانا، تاکہ ساری دنیا کی مختلف قوموں میں یہ طریقہ "امام" کے طور پر مان لیا جائے، سب باتیں رسول اکرم ﷺ کے فرض منصبی میں داخل ہیں۔ اب اگر قریش غلطی کرتے ہیں اور آپ ﷺ کے ساتھ جہالت اور نادانی کا معاملہ کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں جن نبیوں کا ذکر آیا ہے ان کے حالات میں ان کی قوموں کا یہی سلوک دکھایا گیا ہے۔ اس لئے حضرت نبی کریم ﷺ قریش کے مقابلے میں انتقامی جذبہ پیدا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ معلم (استاد) ہیں۔ آپ کے فرض منصبی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ آپ قریش کو معاف کرتے رہیں۔ کیونکہ انتقام اور تعلیم جمع نہیں ہو سکتے۔ جو نہی استاد میں انتقامی جذبہ پیدا ہوا اسکی شان معلّمی ختم ہوئی۔ ❶

جماعت میں جذبہ انتقام:

لیکن رسول اکرم ﷺ ایک جماعت کے امام اور ایک پارٹی کے مرکز بھی ہیں۔ وہ جماعت یکایک اس بلند اخلاقی سطح پر نہیں آسکتی ان کے لئے بھی عام قاعدہ ہو سکتا ہے، کہ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اسی قدر جس قدر تمہیں تکلیف پہنچائی جائے۔ (نحل ۱۲۶) وہ رفتہ رفتہ اس سطح سے اونچی اٹھے گی۔ اس اس لئے یوں فرض کر لینا کہ آپ کے ساتھیوں میں سے کسی کے دل میں انتقامی جذبہ پیدا نہ ہوگا، فطرت انسانی کا غلط اندازہ لگانا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ کو معلوم ہو جائے کہ آپ کے ساتھیوں میں سے فلاں شخص قریش کی جہالت کا انتقامی جواب دینا چاہتا ہے۔ اس وقت آپ ﷺ کا اس پر خاموش رہنا اور اسے اس امر سے نہ روکنا کیا آپ ﷺ کو اس کے فعل کا ایک حد تک ذمہ دار نہیں بنا دیتا؟ لیکن سوسائٹی میں یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص کو اس کی طبعی رفتار سے ترقی کرنے سے روکا جائے۔ ایک شخص انتقامی جذبے سے جواب دیتا ہے وہ آخر تک پہنچ لے تو اس کے بعد تو درست کرنا ممکن ہے، لیکن اگر اس کے انتقامی جذبے ہی کو کچل دیا جائے تو وہ اپنی فطری

---

❶ قرآن حکیم میں ہے کہ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ (نحل:۱۲۶) اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے اللہ ہی کی مدد سے اور ان پر غم نہ کھا اور تنگ مت ہو، ان کے فریب سے) (مرتب)

تکمیل سے عاجز آ جائے گا۔ اس کی تکمیل کی بہترین سبیل یہی ہے کہ اسے موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنا کام پورا کرلے۔ آخر میں اسے سمجھا دیا جائے گا کہ تم نے غلطی کی۔ اس کی تلافی کرو۔ اس طرح اسے اعتدال پر لانا ممکن ہے۔ لیکن اس کی شخصیت میں سے انتقام کا جذبہ ہی نکال ڈالنا ممکن نہیں۔

جماعتی غلطیوں کی ذمہ داری لیڈر پر:

رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں مثال کے طور پر حضرت عمرؓ ہیں۔ وہ ایک خاص شان رکھتے ہیں۔ ان کی فطرت یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی زیادتی کرے تو وہ دس گنا زیادتی کرکے اس کا جواب دیں گے۔ یہ تو ممکن ہے کہ انہیں زیادہ انتقام لینے سے روک دیا جائے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ انہیں نفس انتقام ہی سے باز رکھا جائے۔

کیا حضرت عمرؓ کے کاموں میں حضرت نبی اکرم ﷺ کی شرکت نہیں مانی جائے گی؟ اور کیا آپ ﷺ ان کے ایک حد تک ذمہ دار قرار نہیں پائیں گے؟

یہ ہے ذنب اور اس کا تدارک کرنا اس کی معافی کا سبب ہے۔

صلح میں ایک پوشیدہ حکمت:

مسلمان دراصل عمرے کے لئے نکلے تھے۔ لیکن دشمن اسے ظاہری صورت کے لحاظ سے جنگی چال قرار دے سکتا تھا۔ کیا چپکے سے شہر میں داخل ہو کر قبضہ کرلینا لڑائی کی چال نہیں ہے؟[1] اس لئے قریش کا آپ کو روکنا ایک حد تک حق بجانب تھا اور اس پر حضرت عمرؓ کا برہم ہونا بھی طبعی چیز تھی۔ اب اگر رسول اللہ ﷺ حضرت عمرؓ کے طرف دار ہو جاتے تو لڑائی قطعی طور پر ہو کر رہتی۔ اور اگر لڑائی ہو جاتی تو نہ صرف قریش کا آنحضرت ﷺ کے ساتھ مل کر کام کرنا قیامت تک ناممکن ہو جاتا جس سے آپ کی فطرت کی تکمیل اس طریق پر نہ ہوتی جس کے لئے قدرت نے آپ کو پیدا کیا تھا، بلکہ مسلمانوں کی ان خفیہ جماعتوں کو بھی نقصان پہنچ جاتا۔ جو مکے میں موجود تھیں (ان کی تفصیل آگے آتی ہے)۔

---

[1] مشہور یونانی شاعر ہومر (Homer) ٹرائی (Tray) کے شہر کی فتح کا حال لکھتے ہوئے یونانیوں کی اس چال کا ذکر کرتا ہے، جس میں انہوں نے ایک بڑا لکڑی کا گھوڑا بنایا اور پھر بہت سے یونانی نوجوان رات کے وقت اس کے پیٹ میں گھس بیٹھے۔ ٹرائے والے اس گھوڑے کو گھسیٹ کر اپنے شہر کے اندر لے گئے۔ رات کے وقت یہ نوجوان گھوڑے کے پیٹ میں سے نکل پڑے اور شہر پر قبضہ کرلیا۔ (مرتب)

صلح کا جواز :

اسلام جس انقلاب کا نام ہے۔ اس میں دفاع بھی ہے اور ہجوم بھی۔ دفاعی جنگ سے تو کوئی منکر ہو ہی نہیں سکتا اور اس میں حملہ آور کو جو نقصان پہنچے اس کی ذمہ داری مدافعت کرنے والوں پر عائد ہوتی ہی نہیں، لیکن ہجومی جنگ میں ہجوم کرنے والوں پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ خصوصاً جب انقلاب اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہو۔ ان ہجومی حملوں میں مخالفین کا جو نقصان ہوگا۔ اس کی ذمہ داری سے حملہ آور بچ نہیں سکتے۔ لیکن قرآن حکیم اس ذمہ داری کو ایک اونچی سطح پر لاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ کیا ان حملہ آوروں کا مقصد لوٹ مار اور فتح تھا؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ نہیں، کیوں کہ اگر مسلمانوں کا مقصد اب اور پہلے فتح و غارتگری ہوتا تو وہ حدیبیہ کے واقعے میں جب وہ مکہ والوں سے یقیناً زیادہ طاقتور تھے، دب کر صلح نہ کرتے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ قرآنی انقلاب کا منشا لوٹ مار اور فتح نہیں اور نہ وہ کسی امپریلزم کا حامی ہے۔ جسے دوسروں پر جبراً ٹھونستا پھرے۔

اس موقعے پر خدا تعالیٰ نے آپ کو اتنی سمجھ دی اور اتنا دل گردہ عطا فرمایا کہ تنہا ساری جماعت کے فیصلے کے خلاف ڈٹ گئے اور قریش کی تمام شرطیں صرف اس لئے مان لیں کہ وہ ''بیت اللہ'' کی عزت کرانا چاہتے تھے۔ کیا آپ کے مشن کا مقصد یہ نہ تھا کہ ابراہیمی طریقہ رائج کیا جائے؟ جب قریش اس دین کے مرکز کی عزت کے لئے شرطیں پیش کرتے ہیں، چاہے وہ کیسی بھی نامعقول شکل میں ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں مان نہ لیا جائے، لیکن جماعت میں یہ سمجھ عام طور پر نہیں آسکتی تھی اس لئے قریش جارحانہ حملہ آور کی شکل میں سامنے آئے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ صلح کی تجویز پیش کرنا ہی بڑی جرات اور ہمت کا کام تھا۔ صرف ایک حضرت ابو بکرؓ تھے جو حضرت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ متفق ہوئے۔ وہ آپ کی سوسائٹی میں نہایت سمجھدار اور اثر والے بزرگ تھے۔ ان کی سمجھ سب میں سرایت کر گئی جس نے سب کو ٹھیک کر لیا۔ اور فیصلہ وہ ہوا جس سے قریش رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ملنے پر تیار ہو گئے۔

پچھلی ''غلطیوں'' کا ازالہ :

جب میل ملاپ بڑھا تو قریش کو معلوم ہوا کہ آپ میں کوئی انتقامی جذبہ ہی نہیں۔ اور نہ آپ کا مقصد اپنا امپریلزم قائم کرنا ہے۔ جہاں ظاہر میں انتقام کی صورت نظر آتی تھی وہاں بھی اصل میں رحمت ہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ جو آپ کی جان لیوا تھے۔ اب آپ پر جان قربان کرنے کو تیار ہو گئے۔ بعد میں آپ ﷺ کی تحریک کو عرب میں جو ترقی حاصل ہوئی اور قریش نے حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت تک جو کام کیا اور صرف رسول

اللہ ﷺ کے اشارے کے ماتحت رہے، وہ سب اسی فیصلے کی برکت تھی جو حدیبیہ میں ہوا۔

غرض اسلامی انقلاب سے جو فائدے حاصل ہوئے تھے، ان کا منبع حضرت نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارک اور آپ کے قریب ترین ساتھی تھے اور اس صلح نے ثابت کر دیا کہ آپ ذاتی طور پر فتح اور شکست اور لٹ مار کے خیال سے بہت اونچے ہیں۔ لیکن آپ کی انقلابی جماعت کے کارکن آپ کی طرح غلطی کرنے سے پاک نہیں تھے، ان سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں، اس صلح نے آپ ﷺ کو ان سے بھی بری ثابت کر دیا اور یہ بھی دکھا دیا کہ آپ ﷺ کے ساتھیوں کی غلطیاں بھی عام غارتگر جماعتوں کی خود غرضانہ غلطیوں سے زیادہ اونچی طرز کی تھیں۔ آگے چل کر آپ ﷺ کے ساتھیوں کے اس کیریکٹر پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

اگلی "غلطیوں" کا ازالہ:

قریش کے ساتھ آئندہ جو معاملات پیش آئیں گے، ان میں بھی انتقامی صورتیں اسی طرح آئیں گی۔ جس طرح پہلے آچکی ہیں۔ وہ بھی سب ظاہر ہیں "ذنب" ہوں گی۔ لیکن اس واقعہ نے جس طرح پہلی نام نہاد غلطیوں کے متعلق تمام شبہے دور کر دیئے اور انتقام کا الزام آپ ﷺ پر سے دھو دیا۔ اسی طرح آئندہ بھی جو شخص ظاہری انتقامی شکلوں کو اس فیصلے کے سامنے رکھ کر دیکھے گا وہ سوچ ہی نہیں سکے گا کہ رسول اللہ ﷺ قریش کے لئے کوئی انتقامی فکر پیدا کر سکتے تھے۔ اس طرح آئندہ انتقامی صورتیں بھی اس واقعے کی روشنی میں صاف ہو جائیں گی۔ اور نام نہاد ذنب کا گمان کلیتہً زائل ہو جائے گا۔

جس قوم کے ساتھ تم اب مل کر کام کرنا چاہتے ہو اس کی یہ نظیر ہے۔

انسان کی ارتفاقی زندگی اور انتقام:

امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا یہ ایک ادنیٰ حصہ ہے کہ انسان ارتفاقات [1] کی ترقی سے اپنی حیوانیت کی تکمیل کرتا ہے۔ اس تمام عمل کے نیچے انسان کی عقلیت یا ملکیت کام کرتی ہے، ارتفاقی زندگی میں پہلی منزل گھر کی زندگی ہے۔ گھریلو زندگی میں انتقامی جذبے کے ماتحت کوئی ترقی نہیں ہو سکتی، اور نہ گھر کے لوگوں کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ کر کوئی کام ہو سکتا ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک بادشاہ کی اطاعت کر رہے ہیں، مگر بادشاہ کون ہے؟ باپ میں انتقام نہیں ہوتا، صرف رحمت اور محبت ہوتی ہے، مگر بادشاہ کے حکم میں انتقام آتا ہے۔ جب ایک ہی شخص

[1] زندگی بسر کرنے کے طور طریقے۔ (مرتب)

بادشاہ بھی ہو اور باپ بھی ہو تو صورت یہ ہوگی کہ ظاہر میں انتقام ہوگا لیکن اندر سے رحمت اور محبت۔ اس طرح خانگی زندگی ترقی کرے گی۔ محلے، گاؤں، شہر، ملک اور ممالک یا بین الاقوامی زندگی میں بھی اسی طرح ترقی کرنی چاہیے۔ اگر انتقام کی صورت آ جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ مگر انتقام کی سپرٹ نہ ہو۔ جب مخالف لوگ ہمارے ساتھ مل کر بیٹھیں تو انہیں معلوم ہو کہ وہ انتقام نہیں تھا، بلکہ رحمت تھی۔ جب کوئی تحریک اس انداز پر ترقی کرتی ہے وہ انسانیت میں جائے گیر ہو جاتی ہے۔

جن لوگوں نے اسلام کو فقط فاتحانہ انداز میں بند کر دیا ہے یعنی لڑے اور فتح پائی۔ تو یہ اسلام ہے اور شکست کھا گئے تو کفر ہے، وہ کبھی اسلام کو دنیا میں کامیاب نہیں بنا سکتے۔ جب تک فتح و شکست میں ایک ہی جذبہ۔۔۔۔ محبت اور رحمت۔۔۔۔ کام نہ کر رہا ہو۔ اور اس کے نیچے فائدہ پہنچانا اور خدمت کرنا نظر کے سامنے نہ ہو، اس وقت تک اسلام مکمل نہیں ہوتا [1] مگر لوگوں نے رسول ﷺ کو ایسی ہستی بنا رکھا ہے جس کے کسی فعل یا نمونے کی پیروی ممکن ہی نہیں۔ اس طرح وہ ایک نمونہ جو ساری انسانیت کے لئے پیش [2] کیا گیا تھا، نظروں سے اوجھل کر دیا گیا!

(ب) ویتم نعمتہٗ علیك (اور اپنی نعمت تجھ پر تمام کرے)

”اتمام نعمت“ سے کیا مراد ہے؟:

قریش جو تیری اپنی قوم ہے، وہی تیرے دست و بازو بن کر کام کریں گے اور دعوت ابراہیمی کو دنیا میں اونچے درجے پر غالب کریں گے یعنی اسے بین الاقوامی مرکز میں لا کر غلبہ دیں گے۔

”اتمام نعمت“ کے معنوں کے لئے امام ولی اللہ دہلوی کی وہ تشریح دیکھنی چاہیے جو وہ ''بین الاقوامی سیاست'' کے عنوان سے حجۃ اللہ البالغہ میں کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

فلما کثر ذٰلك فی الملوك اضطروا الی الخلیفة وھو من حصل له من العساکر والعدد مایریٰ کالممتنع ان یسلب رجل اٰخر ملکه فانه انما یتصور بعد بلاء عام وجهد کبیرو اجتماعات کثیرة وبذل اموال خطیرة تتقاصر الانفس دونها وتحیله العادة واذا وجد الخلیفة واحسن السیرة فی الارض وخضعت له الجبابرة وانقادله الملوك تمت النعمة (حجة الله البالغه الجزء الاول ص ۴۷)

---

[1] حضرت نبی اکرم ﷺ نے احد کے ایک معرکے میں شکست کھا کر دانت شہید کراتے ہوئے فرمایا: رب اغفر قومی انهم لا یعلمون (خدایا میری قوم کو بخش دے، یہ لوگ مجھے پہچانتے نہیں۔) یہ تھا جذبہ محبت و الفت جس نے حدیبیہ کے بعد آپ کے مخالفین کے دلوں میں بھی اثر کیا۔ اور ثابت کر دیا کہ آپ معلم اور باپ، ہیں منتقم اور فاتح نہیں (مرتب)

[2] لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (تمہارے لئے اللہ کا یہ رسول ایک نمونہ ہے)۔ (سورۃ احزاب۔۲۱)

"یعنی جب قومی بادشاہوں میں حسد اور بغض بڑھ گیا۔ تو انسانوں کو خواہ مخواہ ایسے خلیفہ کی ضرورت پڑی جسے فوج اور سامان جنگ کی اتنی کثرت حاصل ہو کہ کسی شخص کا اس سے ملک چھین لینا ناممکن کے قریب ہو۔ کیونکہ ایسے بادشاہ سے ملک کا چھیننا اسی صورت میں تصور میں آتا ہے جب اس کے سب ملکوں میں عام بغاوت پیدا ہو جائے اور اسے ملک داری سے ہٹانے کے لئے بہت ہی کوشش کی جائے۔ بڑے بڑے اجتماعات کئے جائیں اور بے انتہا روپیہ صرف کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کوشش سے عام انسان عاجز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ناممکن کے قریب سمجھا جاتا ہے کہ ایسے بادشاہ کو اس کے عہدے سے ہٹایا جائے۔ جب ایسا خلیفہ قائم ہو جائے اور اس کی سیرت بھی اچھی ہو، اور بڑے بڑے زبردست لوگ اس کے تابع ہو جائیں اور ارد گرد کے تمام بادشاہ اس کی اطاعت اختیار کر لیں تو سمجھنا چاہئے کہ نعمت انتہا کو پہنچ گئی"۔

گویا حضرت امامؒ کے نزدیک بین الاقوامی غلبے ہی کا نام اتمام نعمت ہے۔

(ج) وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ (اور تجھے سیدھی راہ چلائے)

سیدھی راہ:

رسول اللہ کی کامیابی کا صحیح پروگرام یہ ہے کہ قریش آپ کی تعلیم کے خادم بنیں۔ اور آپ ﷺ کے اصول پر جو حکومت پیدا ہو اسے چلائیں۔ تاکہ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہم السلام کی دعا عمل میں آئے۔ [1]

اگر یہ صورت پیدا نہ ہو، اور آپ دوسری قوموں کی مدد سے اپنا پروگرام کامیاب بنا کر دکھادیں۔ تو گو آپ انسانیت پر ایک بہت بڑا احسان کرنے والے گنے جائیں گے۔ لیکن ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کی دعا کا مصداق نہ ٹھہریں گے۔ پہلے نبیوں کی برکتوں کا مصدق بننا تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ قریش کو اپنا مددگار بنائیں۔ پہلے سب نبی اپنی اپنی قوم کو دعوت دیتے چلے آئے ہیں اور انہیں ساتھ ملا کر کام کرتے رہے ہیں۔ اس لئے آپ کا بھی فرض ہے کہ اپنی قوم کو ساتھ ملائیں۔ کیوں کہ کام کرنے کا طبعی طریقہ یہی ہے۔ اس سے آپ کا طریقہ وہ ہو جائے گا جو حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر آپؐ تک ایک ہی طرح قائم رہا۔ یعنی پہلے قومی انقلاب مکمل کرنا پھر اسے

---

[1] ان کی دعا کے الفاظ یہ ہیں: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝١٢٧ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝١٢٨ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝١٢٩ (اے ہمارے رب! (اسے) قبول فرما۔ بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے، اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا تابع بنائے رکھ اور ہماری نسل سے ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے حکموں کے نیچے رہ کر زندگی بسر کرے۔ اور ہمیں مناسک سکھا اور ہم پر رحم فرما۔ تو رحمت کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری اس نسل میں (جس کی ہم نے دعا کی ہے) انہی میں سے ایک (ایسا) رسول پیدا کر جو انہیں تیرے حکم پڑھ کر سنائے، قانون سکھائے (اس قانون کی) حکمت بتائے، اور انہیں پاک کرے بے شک تو عزت دینے والا حکمت دینے والا ہے)

بین الاقوامی درجے تک کامیاب بنانے کی کوشش کرنا۔ اگر آپ بھی اس طریق پر کام کریں تو یہ طریقہ رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے مستقل پروگرام بن جائے گا اگر آپ پہلے نبیوں کے طریق سے ہٹ کر طریقہ اختیار کریں، تو وہ آئندہ انسانیت کے لئے تبدیل ہوسکنے والا پروگرام نہ ہوگا۔ غرض حضرت نبی اکرم ﷺ یہی طریق اختیار کیا کہ پہلے اپنی قوم کو درست کیا اور انہیں اپنا دست و بازو بنایا۔ پھر ان کی مدد سے دوسری قوموں کے ایک ایک حصے کو ساتھ ملایا۔ پھر اس حصے نے اپنی اپنی قوم میں یہ انقلابی کام کیا اور قرآن حکیم کی تعلیم پھیلا کر اس انقلاب کی تکمیل کی۔ چنانچہ حضرت امام ولی اللہ دہلوی نے قوم بقوم اسلام پھیلنے کا جو طریق تاریخی طور پر ثابت کیا ہے اس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ آج بھی جو قوم قرآن کے انقلاب کو بین الاقوامی درجے پر کامیاب بنانے کا تہیہ کرے وہ اسی طریق سے اسلام کی تعلیم کامیاب بنا سکتی ہے۔ یہ تنظیم و تربیت ہی انقلاب کی روح ہے۔

(۳) وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝ (اور اللہ تجھے زبردست مدد دے)

کل قومی حکومت تیری اس کمزور جماعت ہی کے ذریعے سے مہیا ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت سے پہلے ان غریب اور بے کس عربوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے تختے الٹ کر رکھ دئے۔ اور ان کی جگہ قرآن کا قانون چلایا۔ اس انقلاب کی بنیاد انسانی فطرت کی ضرورتوں پر تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ سب قوموں کے عقلمند لوگوں نے اسے مان لیا۔ اس طرح یہ تحریک روز بروز بڑھتی گئی۔ یہ سب کچھ اس صلح حدیبیہ کا نتیجہ تھا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ

(وہی ہے جس نے ایمانداروں کے دلوں میں اطمینان اتارا۔ تاکہ ان کے ایمان کے ساتھ اور ایمان بڑھ جائے)

صحابہ کا ایمان :

نبی اکرم ﷺ کی جماعت نے یہ سن کر کہ، "حضرت عثمانؓ شہید کر دئے گئے ہیں جو اہل مکہ کے پاس گفت و شنید کرنے گئے تھے تو آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی۔ اس خبر سے صلح کا دروازہ کھلا۔ اور حضرت نبی اکرم ﷺ صلح کے لئے سب سے نچلے نقطے پر اتر آئے۔ یہ بات اس لڑنے والی طاقت کو جو موت پر بیعت کر چکی تھی سخت ناگوار گزری۔ لیکن خداوند تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کے ذریعے سے سب کو ان ناگوار شرطوں پر اطمینان عطا کیا۔

پہلا ایمان موت کی بیعت سے ظاہر ہوا اور دوسرا ایمان ان ناگوار شرطوں پر صلح قبول کرنے سے۔

(ب) وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے ہیں)۔

اب ان کی کیفیت وہی ہے جو آسمان پر خدا کے فرشتوں کی ہے۔ یہ جماعت رسول اللہ ﷺ کے لئے فرشتوں کی طرح ہے۔ کہ وہ آپ کے حکم کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں[1]

(ج) وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (اور اللہ علم اور حکمت (دینے) والا ہے)۔

اللہ دنیا والوں کو حکمت دینا چاہتا ہے، اس علم و حکمت کے دینے کے لئے اس نے فرشتوں جیسے انسانوں کا لشکر تیار کر دیا ہے۔

آسمانی فرشتے حکمت لاتے ہیں، اور انسانوں کو دیتے ہیں، اب ان انسانوں (مسلمانوں) کا کام یہ ہے کہ حکمت الٰہی کو دنیا میں پھیلائیں۔ یہ لڑتے ہیں تو باغی طاقت کو تباہ کرنے کے لئے جو مسکینوں کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے، اور صلح کرتے ہیں تو مسکینوں کو آگے بڑھنے کا موقعہ دینے کے لئے۔ یہ خدا کی خوشنودی انسانیت کی خدمت کے ذریعے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

انسانیت کی خدمت:

یہاں ہم اس جملے کو صراحتًا دہرا دینا چاہتے ہیں کہ انسانیت کی خدمت کرنا ہر ایک شریف انسان کا طبعی فرض ہے۔ جس طرح ماں باپ بچے کی خدمت بے غرضی کے ساتھ کرتے ہیں، اسی طرح ایک شریف انسان اپنے احاطہ انسانیت کی خدمت کرنا اپنا طبعی فرض جانتا ہے۔ یہ خدمت دو شکلیں اختیار کرتی ہے۔

ا۔ ایک انسان ہے جو اس خدمت کا بدلہ دنیا میں سونے چاندی اور عزت کی شکل میں مانگتا ہے۔ یہ بادشاہوں کی جماعت ہے۔

۲۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اس خدمت کا بدلہ دنیا میں پیسے اور عزت کی شکل میں لینا ضروری نہیں سمجھتا، اس کی عزت وہی ہے جو اللہ کے ہاں ہے۔ یہ نبیوں کی جماعت ہے۔

قرآن عظیم اس دوسری جماعت کو زندہ کرنا چاہتا ہے، وہ ہر ایک قوم میں اس قسم کے لوگوں کا نمونہ پیدا کر دے گا، اس کے لئے نمونے کی جماعت وہ ہے جو حضرت نبی اکرم ﷺ نے تیار کی۔ اسی نمونے پر ہر ایک قوم میں جماعتیں بنی چاہئیں، یہاں تک کہ سب قومیں اسی نقطے پر جمع ہو جائیں، یہ ہے قرآن کا اصل مقصد۔

"اس خدمت" سے اس جماعت کا مقصود کیا ہے؟ وہ اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] فرشتوں کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (وہ اللہ کے کسی حکم کی بھی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جائے) (التحریم:٦٦)

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۙ

(تاکہ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو باغوں میں پہنچادے۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اور ان کی برائیاں ان پر سے اتار دے اور یہ اللہ کے ہاں بہت بڑی کامیابی ہے)

اس خدمت کا مقصد:

اس جماعت کا نصب العین دنیا کی عزت میں ہے وہ اپنی جان اور مال قربان کر کے اللہ کے قانون کو بلند کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہی قانون ہے جس کے ذریعے سے غریب اور مسکین طبقے کا انتفاع (Exploitation) ختم ہو سکتا ہے۔ وہ خدا کی مخلوق کی یہ خدمت کسی دنیاوی لالچ سے نہیں کرتے۔ وہ جنت عدن (ہمیشگی کے باغات) کی زندگی چاہتے ہیں۔ گو ان کی خدمات کا طبعی نتیجہ یہ بھی ضرور ہو گا کہ وہ دنیا میں بھی سرفراز ہوں گے اور زرخیز اور زرریز علاقوں کے مالک بنیں گے۔

وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ (ان کی برائیاں ان سے اتار دے)

غلطی کی معافی کیوں؟:

اب انہوں نے جس اطاعت شعاری کا اظہار کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی غلطیوں سے فائدہ اٹھانا اپنا مقصد نہیں بنایا۔ وہ جنگ کرتے تھے تو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے، تاکہ اس کا قانون چلے۔ اور مظلوم انسانیت ظالم طبقے کے ظلم سے چھوٹے اور صلح قبول کی تو فقط اللہ کے حکم کے تابع ہو کر تاکہ اس کا نام بلند ہو اور مظلوم انسانیت کچلی نہ جائے۔ ان کی اس ذہنیت کی وجہ سے ان کی غلطیاں جو انقلاب کے دوران میں ان سے ہوتی ہیں، معاف کر دی جائیں گی۔

اس قسم کی بخشش کا اعلان ان لوگوں کے بارے میں بھی ہو چکا ہے جنہوں نے سب سے پہلے معرکہ انقلاب یعنی جنگ بدر میں حصہ لیا۔ ان کی نسبت ایک روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی سب غلطیاں معاف کر دی ہیں۔ اس معافی کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان لوگوں نے اپنی ان غلطیوں سے اپنی ذات کے لئے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ ان کا یہ مقصود تھا۔

وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۙ (یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی کامیابی ہے)

اللہ تعالیٰ نے حجاز سے ایک جماعت کو چن لیا ہے اور انہیں بہت سے امتحانوں میں آزما لیا ہے، اب یہ بہت اونچے درجے پر کامیاب ہوئے ہیں، اس لئے انہیں کل قومی غلبہ دیا جائے گا۔

وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ⑥

(اور تاکہ دغاباز مردوں اور دغاباز عورتوں کو اور اللہ کے متعلق طرح طرح کے برے گمان کرنے والے مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے۔ مصیبت کا پھیرا انہی پر پڑتا ہے۔ اللہ ان پر غصے ہوا اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لئے جہنم تیار کی اور وہ نہایت ہی برے ٹھکانے پر پہنچے)

تھڑدلے: منافقین:

قریش میں سے جو لوگ اس قرآنی انقلاب کے نظریے کو پوری طرح بغیر کسی شرط کے مان چکے ہیں وہ غلبہ پائیں گے، لیکن جو اہل قریش کسی مصلحت کی وجہ سے اس انقلاب کو قبول کرتے ہیں۔ یا حنیفیت ---- تحریک ابراہیمی ---- پر پورا یقین نہیں رکھتے وہ قطعاً ناکام رہیں گے۔

آئندہ چل کر بھی جو لوگ قرآنی نظریہ انقلاب پوری طرح مانیں گے، وہی بین الاقوامی کامیابی حاصل کر سکیں گے۔ اور تھڑدلی کے ساتھ اطاعت کرنے والے (منافقین) یا اس پروگرام پر پورا بھروسہ نہ رکھنے والے جو اس میں ادھر ادھر سے اور چیزیں شامل کرنا چاہیں گے (مشرکین) ناکام رہیں گے۔

وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ (اور تاکہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو عذاب میں مبتلا کرے)

مسلمانوں کے اندر ایک جماعت ہے جو قرآن کی اطاعت کا نام تو لیتی ہے، لیکن صلح و جنگ میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو عزت کے ساتھ قبول نہیں کرتی، بلکہ اپنی مصلحتوں کے ماتحت مانتی ہے۔ اگر رسول اللہ کا فیصلہ ان کی اپنی ضرورتوں کے مطابق ہوا تو مان لیتے ہیں نہیں تو انکار کر دیتے ہیں۔ گو وہ کھلم کھلا انکار نہیں کرتے، لیکن عملاً اسے مانتے بھی نہیں۔ یہ منافقوں کی جماعت ہے، ان کا اصل مقصد دنیا کی عزت اور روپیہ حاصل کرنا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ ان کے ذاتی فائدوں سے ٹکرا جاتا ہے۔ اور ان کی ساری سکیمیں برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ ان کے لئے موت اور عذاب ہے۔

وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ (اور شرک کرنے والے مرد اور شرک کرنے والی عورتیں)

رجعت پسند مشرکین:

قریش میں مومنوں اور منافقوں کی جماعتوں کے علاوہ ایک اور گروہ بھی ہے۔ یہ لوگ حنیفیت پر پورا یقین نہیں رکھتے۔ حنیفیت سے پہلے جو دور تھا اور جسے حضرت ابراہیمؑ نے آکر ارتجاعی (Reactionary) بنادیا۔ اس کے علموں اور ہنروں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ وہ فقط اللہ پر بھروسہ کر کے دنیا اور دین اس کے حوالے نہیں کرتے، بلکہ اس میں تھوڑا سا شرک ضرور ملالیتے ہیں۔ انہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ محض خدا پر بھروسہ رکھ کر کام کیا جائے اور اس میں دنیا بھی شامل نہ ہو۔ تو دنیا سے بہتر زندگی (جنت میں) مل سکتی ہے۔ وہ آخرت کی زندگی کو محض خیال کے درجے پر سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اس پرانی ذہنیت کو چھوڑ کر نئی انقلابی ذہنیت کو قبول نہیں کر سکتے۔ ان کا نام قرآن حکیم کی اصطلاح میں مشرکین ہے۔ جب مسلمانوں کو محض اللہ پر بھروسہ کر کے کامیابی ہوگی اور وہ آگے بڑھ جائیں گے، تو یہ مشرکوں کے اصول کے قطعاً خلاف ہوگا۔ وہ مسلمانوں کی کامیابی ناممکن سمجھتے ہیں۔ یہ مشرک لوگ بھی شکست کھاجائیں گے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں کامیابی کا کوئی راستہ نہ پائیں گے اور عذب میں پھنس جائیں گے۔

الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ (اللہ کی نسبت طرح طرح کے بُرے گمان باندھنے والے)

مشرکین کی تحلیل نفسی:

یہ مشرک اللہ پر پورا بھروسہ نہیں رکھتے، انہیں یقین نہیں کہ خدا پر پورا پورا بھروسہ کر کے آخرت میں ہماری ایسی مستقل زندگی شروع ہوسکتی ہے، جس کے مقابلے میں اس عارضی دنیاوی زندگی کو قربان کر دینے میں کوئی گھاٹا نہیں ہے۔ وہ دنیاوی زندگی کی کامیابی کے لئے خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنانا ضروری سمجھتے ہیں۔ مثلاً تناسخ کو ماننے والی قومیں موت کے بعد زندگی مانتی ضرور ہیں مگر اس زندگی کو اس دنیاوی زندگی ہی میں مجسم مانتی ہیں۔ وہ اس مستقل زندگی کا تصور کر ہی نہیں سکتے، جو اس دنیاوی زندگی سے آگے ہے۔ اس لئے انہیں دنیاوی زندگی قائم رکھنے کے لئے حکمران طاقتوں کے ساتھ مصالحت (Compromise) کرنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ اپنے دینی پروگرام کی مخالفت کرنے والے حکمرانوں کے ساتھ سمجھوتہ کئے بغیر آگے بڑھ نہیں سکتے۔ یہ نتیجہ ہے خدا کے متعلق ان کی اس بد ظنی کا کہ وہ تنہا ہماری زندگی کا کفیل نہیں ہوسکتا۔ مشرکوں کی یہ بد ظنی انہیں دنیاوی زندگی میں قدم قدم پر مصالحت (Compromise) کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ اور وہ اپنے نصب العین (Ideal) پر قائم نہیں رہ سکتے۔

خدا کے متعلق اس نیم منفیانہ ذہنیت کا آخری نتیجہ اس کا قطعی انکار ہی ہوتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کے متعلق انسان کی ذہنیت یہ ہو کہ آدھا اقرار ہو اور آدھا انکار تو کامیابی ناممکن ہے۔ اور صحیح معنوں میں بین الاقوامی انسانی حکومت پیدا نہیں ہو سکتی۔ تو خدا کا قطعی انکار کر کے تو یہ نعمت (کل قومی حکومت) حاصل ہونا قطعاً ناممکن ہو جاتا ہے۔

اس وقت یورپ میں امپیریلزم (Imperialism) کے رد عمل کے طرز پر جو غلط سیاست اور غلط مذہبیت کی پیداوار تھا، کمیونزم (Communism) پیدا ہو چکا ہے، اس میں خدا کا انکار لازم ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے انکار کی وجہ ہی سے وہ بھی امپیریلزم کی شکل اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا پہلا قدم استعماریت (Cocaslaism) ہے جس کا لازم نتیجہ امپیریلزم ہوگا۔ اسے اس دوسری بڑی جنگ (1939-1945) میں امپریلسٹ طاقتوں کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑا، جس کی وجہ سے اسے اپنا کمنٹرن (Commintern) یعنی بین الاقوامی نظام توڑ کر ان سرمایہ دار طاقتوں کے ساتھ مصالحت (Compromise) کرنی پڑی۔

نام نہاد کمیونزم میں جس قدر مسکین نوازی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مسکین نوازی امام ولی اللہؒ کے فلسفے میں ہے اور اس میں مزدور اور کاشتکار کے حقوق کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد خدا کے صحیح اور صاف تصور پر ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک کارکن اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زندہ تصور کے ساتھ گزارتا ہے، کہ خدا تعالیٰ اس کے سامنے ہے یا کم سے کم یہ کہ خدا تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ یہ تصور بھی ایک زندہ اور پائیدار شکل میں اپنے سامنے رکھتا ہے، کہ اگر اس نے کم تولا یا کسی کے حق کو ناجائز طور پر پاؤں تلے روندا تو وہ دنیا میں بھی سزا پائے گا اور مرنے کے بعد بھی اسے خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ امام صاحب کی حکمت اسے یہ بھی سکھاتی ہے کہ قرآن حکیم پر عمل کرنے والے کارکن کو خدا کے سوا کسی سے اپنے عمل کا بدلہ لینا ضروری نہیں۔ انسان بیشک اس لئے پیدا ہوا ہے کہ دنیا میں قرآن حکیم کی حکومت بین الاقوامی درجے پر چلائے، لیکن وہ اس حکومت کے ذریعے سے اپنے لئے یا اپنے خاندان کے لئے کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

قرآن حکیم کی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی حکومتیں بے نظیر ثابت ہوئیں اور آج تک دنیا ان کی مثال پیدا نہیں کر سکی۔ اب اس دور میں بھی امیر المومنین سید احمد شہیدؒ (1831-1886) اور ان کے ساتھیوں نے انہی اصول پر اس نمونے کی حکومت پیدا کر کے، ایک دفعہ پھر دکھا دی اور ثابت کر دیا کہ اس قسم کی حکومت پیدا کرنا ہر زمانے میں ممکن ہے۔ قرآن حکیم کے ماننے والوں کے لئے اس میں بہت بڑی عبرت اور ذمہ داری ہے۔

عَلَيۡهِمۡ دَآئِرَةُ السَّوۡءِ (ان پر مصیبت کا پھیر پڑتا ہے)

وہ نہ دنیا پائیں گے نہ آخرت۔

وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَلَعَنَهُمۡ (اللہ ان پر غضبناک ہوا اور اس نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا)

یہ انقلاب ان مذہبی قوموں کے لئے عذاب ہے، جو ابراہیمی طریق سے پہلے کے طریق کو نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس میں یہودی اور عیسائی بھی شامل ہیں اور ہندو اور بدھسٹ بھی، جو ابراہیمؑ کے نئے پیدا ہوئے طریق کو قبول نہیں کرتے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

(آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے ہیں، وہ عزت دینے والا حکمت دینے والا ہے)

منافقوں اور مشرکوں کی جماعتیں الگ کر دینے کے بعد مؤمنوں کی جو خالص جماعت رہے گی، وہ زمین پر آسمانی فرشتوں کے مانند ہو گی۔

قرآنی سیاست کے بنیادی اصول:

قرآن حکیم کا پروگرام حقیقت میں پارٹی پالیٹکس (Party Politics) کے اصول پر صحیح اترتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ صرف ایک خیال رکھنے والوں کو اکٹھا کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس اصول پر کام کیا۔ اور ان مٹھی بھر لوگوں کو جمع کیا جو قرآن کے سارے قانون کو دل و جان سے کامل طور پر بلا شرط مانتے تھے۔ اور صلح و جنگ میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو خوشی کے ساتھ قبول کر کے کیوں اور کیسے کے سوالات پوچھے بغیر اطاعت کرتے تھے۔

ہمارے خیال میں اب بھی جو لوگ سب "مسلمانوں" کو اکٹھا کر کے آگے بڑھنے کا پروگرام رکھتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ انہیں ان مسلمانوں میں سے وہ جماعت بنانی چاہئے جو ذہن اور عمل کے لحاظ سے انقلابی ہو اور اس میں صرف ایک فکر کے لوگ شامل ہوں۔ صرف اسی صورت میں کام اچھا اور جلد ہو سکتا ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (اللہ عزت دینے والا حکمت والا ہے)

انٹر نیشنل طاقت کا وعدہ:

اللہ تعالیٰ مومنوں کی اس جماعت کو عزت اور حکمت دینا چاہتا ہے یعنی یہ جماعت مضبوط حکومت قائم کرے گی، جس کی کوئی دوسری حکومت بے عزتی نہ کر سکے گی اور یہ حکمت و دانش کے مالک ہوں گے۔

آیت نمبر ۴ میں تھا علیماً حکیماً (علم اور حکمت دینے والا) یعنی یہ لوگ علم اور حکمت میں طاق ہو کر تمام علمی سوسائیٹیوں کو قائل کر لیں گے کہ ابراہیمی تحریک کے سوا کوئی تحریک انسانیت کو مجموعی طور پر آگے بڑھانے والی نہیں ہے، اس کے بعد وہ اتنی بلند انٹر نیشنل طاقت بنا لیں گے کہ ان کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے گا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں اس انٹر نیشنل طاقت کا ڈھانچہ بنا اور حضرت عثمان غنیؓ نے اسے بہت دور تک پھیلا دیا۔ اور اس کی عزت اتنی بلند ہو گئی کہ دنیا کی تمام دوسری طاقتیں مل کر بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔

(۸) اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ۙ۸

(ہم نے تجھے احوال بتانے والا، خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا)

نبی اکرم ﷺ بطور معلم اور نذیر

رسول اکرم ﷺ کی یہ دو حیثیتیں اس طرح ہیں۔

(۱) معلم (۲) جماعت کا لیڈر

معلم کی حیثیت سے آپ شاگردوں کے متعلق شہادت دیتے ہیں کہ فلاں شاگرد فلاں قابلیت کا ہے۔ اور فلاں شاگرد فلاں قابلیت کا۔ یہاں آپ کی شان معلّمی ختم ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد وہ شاگرد آپ کے ساتھ ایک جماعت کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ آپ اس جماعت کے رہنما ہیں۔ یہ جماعت منافقوں اور مشرکوں سے بالکل الگ اور خاص صفتوں کی مالک ہے۔ یہ جماعت قرآن کے اس پروگرام پر چلتی ہے کہ مظلوم انسانیت کی خدمت کرو، ظالموں کو گراؤ۔ اور مظلوموں کی داد رسی کرو۔ اور اس سارے کام کا بدلہ صرف اللہ سے مانگو۔ اس پروگرام پر جو ٹھیک ٹھیک طور پر کام کرتا ہے اسے حضرت نبی اکرمؐ کامیاب زندگی کی بشارت دیتے ہیں۔ (مُبَشِّرًا) اور اسے یقین دلاتے ہیں کہ اس کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے فوائد محفوظ ہیں۔ جو لوگ اس پروگرام پر ٹھیک ٹھیک نہیں چلتے، انہیں خبردار کرتے ہیں کہ جن کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی ناکام رہے گی۔ وہ بہانے بنا کر دل کو خوش کرلیں، لیکن کامیابی نصیب نہ ہوگی۔ (نَذِیۡرًا)

(۵) لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ تُعَزِّرُوۡهُ وَ تُوَقِّرُوۡهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوۡهُ بُکۡرَةً وَّ اَصِیۡلًا ۙ۹

"تم ضرور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اس کی مدد کرو۔ اور اس کا وقار قائم کرو۔ اور صبح و شام اس کی پاکیزگی بیان کرو۔"

خدا کی محبت کی معنی

حضرت نبی اکرم ﷺ کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں خدا کی محبت ہے، انہیں ایک استاد کی ضرورت ہے، جو انہیں بتائے کہ محبت کیسے کی جاتی ہے اور خدا کی محبت کی دعویٰ سے انسانوں کی خدمت کس طرح ہونی چاہیے۔

خدا کی طرف سے الزام :

مرنے کے بعد ہر ایک انسان سے اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ میں نے تجھ پر جو انعام کیا، تو نے اس سے میرے لئے کیا کیا؟ وہ لمبی چوڑی باتیں بنائے گا۔ مگر اسے یہ کہہ کر جھوٹا کر دیا جائے گا کہ میں تیرے دروازے پر بھوکا پیاسا اور بیمار ہو کر آیا۔ لیکن تو نے مجھے نہ کھانے کو دیا نہ پینے کو نہ میری تیمارداری کی، حضرت مسیحؑ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی اپنی تعلیم میں اسے بہت اچھی طرح کھول دیا ہے۔ اس چیز کو عام ذہنیت سے نہیں سمجھنا چاہئے۔ بلکہ اسے پوری پوری اہمیت دینی چاہئے۔

معاشی مسئلے کی اہمیت امام ولی اللہؒ کے نزدیک :

امام ولی اللہ دہلویؒ معاشی زندگی کے اس پہلو کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب تک انسان کھانے پینے کی فکروں سے آزاد نہ ہو جائے، وہ شائستگی کی ایک منزل سے دوسری منزل میں ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ اور اگر وہ ان تفکرات میں پھنسا رہے تو اس کی طبعی ترقی رک جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت امامؒ، بدور بازغہ ص ۵۰ میں فرماتے ہیں کہ :

"انسان شائستگی کے دوسرے درجے تک اسی صورت میں ترقی کر سکتا ہے جب وہ بھوک پیاس اور تسکین جذبہ جنسی، غیر طبعی حاجتوں سے فارغ البال ہو جائے۔"

اس حقیقت کو کہ، "انسان کی ابتدائی ضرورتیں پوری نہ ہوں، تو سوسائٹی پر کیا اثر پڑتا ہے؟" ایک تاریخی مثال کے ذریعے سے بھی واضح کرتے ہیں۔ جس میں ایرانی اور رومی سوسائٹی کی گراوٹ دکھا کر قرآنی انقلاب کی ضرورت ظاہر کرتے ہیں۔ (دیکھئے حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۱۰۵)

معاشی مسئلے کے بعد :

غرض بھوک کا مسئلہ انسانی معاشرے (سوسائٹی) کا بہت ضروری مسئلہ ہے، لیکن یہ مسئلہ فقط اسی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ کسی انسان کا ایک وقت پیٹ بھر دیا جائے۔ اس کے بال بچوں کا کون ذمہ دار ہے؟ پس ضرورت ہے کہ اس مسئلے کو مستقل شکل میں حل کیا جائے اور بھوکوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ انہیں خیرات کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اس کے بعد ہی وہ ترقی کرنے کے خیالات سوچ سکتے ہیں۔

جب خداوند تعالیٰ ایک بھوکے کے پیٹ کی ضرورت پوری نہ کرنے پر ایک بڑے آدمی کو جھوٹا قرار دے سکتا ہے، تو کیا ایک انسان کی دماغی ضرورت پورا نہ کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی حساب نہ ہوگا؟ ایک انسان کا

دماغ بھوکا ہے اسے علم چاہئے، جس کے پاس علم ہے وہ اسے علم کیوں نہیں پہنچاتا؟ خدا اور بندے کے درمیان بھوکوں اور پیاسوں کے متعلق جواب طلبی کے سلسلے میں جو بات چیت ہوگی، اس کے بعد یقیناً ان لوگوں سے بھی جواب طلبی کی جائے گی جو مظلوم انسانیت کو علم سے محروم رکھتے ہیں۔ جو شخص علم دینے کی اجرت طلب کرے گا وہ سارا بنا بنایا نظام بگاڑ دے گا۔

حجازی انقلابیوں کی افضیلت :

ہم نے اشتراکی کارکنوں (Communist Workers) کو کام کرتے دیکھا۔ ہم عش عش کرکے رہ گئے، لیکن جب ہم نے کمیونسٹ حکمرانوں کو دیکھا تو ہمیں ان پر لعنت بھیجنی پڑی۔ ہم نے دیکھا کہ زار کی قیصریت ان کے گھروں میں ناچ رہی ہے۔ اس مشاہدوں اور تجربوں کے بعد ہی رسول اللہ ﷺ کی پہلی جماعت کی عزت سمجھ میں آتی ہے۔ ہم قرآن عظیم کے اس پروگرام کے سوا جسے حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت تک کامیاب کرکے دکھایا گیا اور جس کی تفصیل امام ولی اللہ دہلوی نے ازالۃ الخفاء میں بیان کی ہے۔

اور کسی چیز کو قابل اطمینان نہیں پاتے۔ چنانچہ روس کی پنچائتی پرجاراج (USSR) کے آئین کی دفعہ ۱۲ میں ہے کہ :

"The Principle applied in the U.S.S.R. is that of Socialism: "From each according to his ablility، to each according to his work".

”روس کے پنچائتی پرجاراج میں اشتراکیت کا یہ اصول کارفرما ہے کہ ہر شخص پنچائت کا کام اپنی قابلیت کے مطابق کرے۔ اور اسے اس کے کام کے مطابق دیا جائے۔“

لیکن حضرت نبی اکرم ﷺ اور آپ کے پہلے جانشین (خلیفہ) حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں یہ اصول کارفرما تھا کہ : ”ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق خدمت کرے اور اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے“۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت جب بعض لوگوں نے بعض لوگوں کو افضل قرار دینے کا مطالبہ کیا تو فرمایا کہ :

اما ما ذکرتم من السوابق والقدم والفضل فما اعرفنی بذالك وانما ذالك شيءٌ ثوابه، علی الله جل ثناء ه وهٰذا معاش فالا سوة فيه خير من الاثرة (ابی یوسف۔ ص ۴۲۔ مطبہ بیروت)

”یعنی تم نے سب سے پہلے ایمان لانے والے اور بہت لمبے زمانے سے اسلام کی خدمت کرنے والے لوگوں کا جو

ذکر کیا ہے، تو مجھ سے کون بہتر جانتا ہے۔ لیکن وہ تو ایسی چیز ہے جس کا ثواب انہیں ان کے پروردگار کے ہاں سے ملے گا۔ اور ہم تو معاش تقسیم کررہے ہیں، اس میں تو فوقیت کی بہ نسبت مساوات بہتر ہے"۔

غرض ہم نے رسول کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر صرف اس لئے بھیجا ہے کہ یہ جماعت جو خدا سے محبت رکھتی ہے، اُس سے محبت کا پروگرام سیکھ لے۔ اور اسے کامیابی سے چلائے۔ خدا سے محبت کرنے کا مطلب ہے، خدا کی مظلوم مخلوق کی خدمت کرنا اور اس خدمت کا اجر اللہ سے مانگنا۔ اور یقین رکھنا کہ جو خدا تمہیں آسمان میں جنت دے سکتا ہے وہ تمہارے لئے زمین پر بھی راحت آرام اور عزت کی جنت پیدا کرسکتا ہے۔ یہ درجے طے کرانا رسول اللہ ﷺ اللہ کا کام ہے۔ اللہ پر یہ پکا ایمان ہونا چاہیے کہ اس نے جو تعلیم دی ہے، وہ ٹھیک ہے اور اس پروگرام پر عمل کرنے سے دنیا میں بھی ہمارے لئے جنت بن سکتی ہے۔ ہم یہاں بھی حکومت اور عزت کے لحاظ سے کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ (اس آیت میں غائب کی جتنی ضمیریں ہیں، وہ سب اللہ کی طرف پھرتی ہیں۔

تُعَزِّرُوْهُ: اللہ کی مدد کرو۔

رسول اللہ کی معرفت جو تعلیم ملی ہے، اسے غالب کرنے میں جو مدد دی جائے گی، وہ اللہ ہی کی مدد ہے۔

تُوَقِّرُوْهُ: اللہ کا وقار قائم رکھو۔

رسول اللہ ﷺ کی معرفت جو تعلیم ملی ہے، اس کا وقار دنیا میں قائم کرنا اللہ کا وقار قائم کرنا ہے۔

تُسَبِّحُوْهُ: اسے پاک سمجھو۔

یہ خیال نہ کرو کہ مدد مانگنے سے اللہ محتاج ہوگیا۔ یہ خیال غلط ہے، اسے عیب سے بالکل پاک سمجھو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تعلیم کے غلبے کا مطلب ہے غریبوں اور مسکینوں کا غلبہ۔ پس اللہ کی مدد کرنے اور اس کا وقار قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مسکینوں کی مدد کرو۔ اور وہ جس ظلم کے جوئے تلے آئے ہوئے ہیں، اس سے انہیں نکال کر ان کا وقار قائم کرو۔ اللہ تک پہنچنے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

(۱۰) اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

(جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں، وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے، جو شخص اس عہد کو توڑتا ہے وہ اسے اپنی جان پر توڑتا ہے۔ اور جو شخص وہ عہد پورا کرتا ہے جو اس نے اللہ سے کیا تو عنقریب اللہ اسے بہت بڑا اجر دے گا۔)

بیعت رضوان کی حقیقت :

یہ عہد اللہ سے براہ راست ہے۔ گویا تعزروہ اور توقروہ کی عملی تفسیر ہے۔

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے)

یہ ہے رسول اور مسلمانوں کا باہمی تعلق۔ رسول مسلمانوں کے سامنے خدا بن کر نہیں آتا، بلکہ وہ خدا کا نمائندہ ہے۔ اس لئے اس کے ہاتھ پر جو بیعت کی جاتی ہے، اور اس کے ساتھ جو عہد باندھا جاتا ہے، اس کے متعلق یہ یقین رکھنا چاہئے کہ وہ خدا کے ساتھ معاہدہ کیا جارہا ہے، اس کی پوری پوری اہمیت ہر وقت آنکھوں کے سامنے رکھنی چاہئے، کسی معاملے پر خدا کے ساتھ معاہدہ کرنا بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لینا ہے۔

فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ (جو شخص اس عہد کو توڑتا ہے، وہ اسے اپنی جان پر توڑتا ہے)

عہد شکنی کی سزا :

جو شخص خدا کے ساتھ عہد باندھ کر توڑتا ہے۔ وہ اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔ جماعتی سیاست (Party Politics) میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص پارٹی کے ڈسپلن کو قبول کرنے کے بعد اس کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔ جب وہ اپنی جماعت کے فیصلے کے خلاف کوئی حرکت کرنے لگے، اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے خلاف ضابطے کی انتہائی کارروائی کی جاسکتی ہے اور وہ غداری کرکے سزا سے نہیں بچ سکتا۔ مرنے کے بعد تو وہ خدا کے عذاب میں پڑے گا ہی، اس دنیا میں بھی وہ بڑی سے بڑی سزا پانے کے لائق ہے۔ جو جماعت خدا کے قانون کو چلانے کے لئے اٹھے اسے اس قسم کا انتہائی ضبط قائم کرنا پڑے گا اور کسی رکن کے متعلق کسی قسم کی رواداری، جانبداری اور رعایت نہیں کرنی ہوگی، چونکہ اس کا فیصلہ قطعی ہوگا۔ اس لئے معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے فیصلہ کرنا ہوگا اور پھر اسے انتہاتک پورا کرنا ہوگا۔ انقلابی جماعتوں میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ قرآنی انقلابی جماعت اس قسم کے شدید ضبط (Iron Discipline) سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ یہ ہر ایک انقلابی جماعت کی طبعی ضرورت ہے۔

وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

(جو شخص وہ عہد پورا کرتا ہے، جو اس نے اللہ سے کیا۔ تو عنقریب اللہ اسے بہت بڑا اجر دے گا)

جو شخص اپنے عہد کو پارٹی ڈسپلن (جماعتی انضباط) کے مطابق پورا کرے گا۔ وہ ہر قسم کی عزت اور اختیارات کا مستحق سمجھا جائے گا اور وہ خدا تعالیٰ کے ہاں سے بہت بڑا اجر پائے گا۔ یہ اجر جلدی ہی ملے گا۔ (اس میں ایک جنگ کی طرف اشارہ ہے جس پر مسلمانوں کو جانا ہوگا۔ اس کا ذکر آیت نمبر ۱۵ میں آئے گا۔)

جو لوگ جند اللہ (خدائی لشکر) کے مخالف ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔

(۱) منافق اور (۲) کافر

آیات ۱۱ تا ۲۱ میں منافقون کا ذکر ہے اور ۲۲ تا ۲۶ میں کافروں کا۔

ارتجاعی ذہنیت

(۱۱) (ا) سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا (اور اب وہ لوگ جو گنواروں میں سے پیچھے رہ گئے، تجھے کہیں گے کہ ہم اپنے مالوں اور گھر والوں کے کاموں میں لگے رہ گئے)

منافقین:

جو بدوی (اعراب) اس سفر میں آپ ﷺ کے شریک نہ ہوئے، اب انہوں نے یہ بہانہ پیش کیا کہ ہم اتفاقاً مال اور گھر بار کے جھگڑوں میں پھنس کر پیچھے رہ گئے اور سفر میں آپ کے ساتھ نہ جاسکے۔

(ب) فَاسْتَغْفِرْ لَنَا (ہمارا گناہ بخشواؤ)

ہم اسے غلطی مانتے ہیں، کہ ہم آپ کے ساتھ سفر میں نہ جاسکے اور درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کریں۔

قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے قصور کو مان کر معافی مانگ لے، اس کا جرم اور قصور نہیں مانا جاتا، وہ گویا ایسا ہے جیسے اس نے جرم کیا ہی نہیں۔[1] تو گویا یہ لوگ اپنے آپ کو اس جماعت کے برابر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم انہیں اس غلط بیانی پر تنبیہہ کرتا ہے۔

(ج) يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (وہ اپنی زبان سے وہ بات کہتے ہیں، جو ان کے دلوں میں نہیں ہے) چونکہ وہ منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے، اس سے وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ سفر میں انکے نہ جانے کی وجہ گھر بار اور مال کے جھگڑوں میں پھنسنا نہیں تھا، بلکہ اصل میں ان کی جانے کی نیت ہی نہ تھی، کیوں اس پر سے اگلی آیت میں پردہ اٹھایا گیا ہے۔

(د) قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا (تو کہہ، کس کا بس چلتا ہے اللہ سے۔ اگر وہ چاہے تمہارا نقصان یا چاہے تمہارا فائدہ)

---

[1] التائب من الذنب کمن لاذنب له، (الحدیث) (جو شخص گناہ سے توبہ کرلے وہ اس شخص کی مانند ہو جاتا ہے، جس سے گناہ ہوا ہی نہ ہو (مرتب)

یعنی ہمارا تو اس معاملے میں کوئی دخل نہیں۔ تم اگر شوق سے ہمارے ساتھ چلتے ہو تو ہم تمہیں پیچھے نہ رکھ سکتے تھے اور نہ تمہیں کسی نفع سے روک سکتے تھے۔ اب اگر تم نے ہمارے ساتھ چلنے کا ارادہ نہ کیا تو ہم تمہیں اس نقصان سے نہیں بچا سکتے، جو اب تمہیں برداشت کرنا پڑے گا۔ (اس نقصان کا ذکر آگے آیت نمبر ۱۵ میں آتا ہے) نفع و نقصان تمہارے اپنے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ہمارے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے سامنے عذر پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس پروگرام کو صحیح سمجھ کر خود آگے نہیں بڑھتا، اسے آگے بڑھانے کی نبی یا اس کی جماعت میں کوئی طاقت نہیں۔ اس لئے کہ یہ کام صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

(ہ) بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۱﴾ (بلکہ اللہ تمہارے سب کاموں سے خبردار ہے)

توفیق باندازہ ہمت:

وہ تمہارے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے، ان کے مطابق تمہیں کام کرنے کی توفیق دے گا۔ پس اس جماعت میں شامل ہونے کے لئے لگاتار نیکی کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ درجہ اس قسم کا نہیں ہے کہ اتفاقاً ہاتھ آجائے۔

(۱۲) بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴿۱۲﴾

(کوئی نہیں، تم نے تو خیال کرلیا تھا کہ رسول اللہ اور مسلمان کبھی اپنے گھر لوٹ کر نہیں آئیں گے اور کُھب گیا تمہارے دلوں میں یہ خیال اور تم نے طرح طرح کی بری اٹکلیں کرنی شروع کیں اور تم لوگ تباہ ہونے والے تھے)

منافقین کی نفسی تحلیل:

یہ لوگ جو اس سفر میں شریک نہ ہوئے تو اس لئے نہیں کہ مال و اولاد کے جھگڑوں میں پھنسے رہے۔ بلکہ دراصل ان کی جانے کی نیت ہی نہ تھی۔ انہوں نے یہ خیال پکار کھا تھا کہ قریش ان سے ضرور مقابلہ کریں گے۔ اس لئے جنگ ہوگی۔ یہ لوگ مارے جائیں گے، ہم کیوں مفت کی مصیبت سیہڑیں۔ یہ اب گھروں کو واپس نہیں آسکتے۔

وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (تمہارے دلوں میں بات کھب گئی تھی)

تمہارے دلوں میں یہ چیز جچ گئی تھی۔ اور تم مان بیٹھے تھے کہ یہ لوگ شکست کھا جائیں گے اور زندہ نہ لوٹیں گے۔

وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ (اور تم نے یہ برا خیال پختہ بنالیا تھا)۔ کہ بس اب اسلام ختم ہوگیا۔ جانے دو نہیں۔ ہم

انہیں کے ساتھ موت کے منہ میں کیوں جائیں۔

یہ منافقت کی ایک کھلی نشانی ہے۔ کہ منافق نفع کا تصور کئے بغیر کسی للّٰہی تحریک میں شامل نہیں ہو سکتا۔ وہ سب سے پہلے روپے اور پیسے کا حساب کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس تحریک میں شامل ہونے سے مجھے کتنا نفع حاصل ہو گا۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ مالی نفع حاصل نہ ہو گا تو وہ بھولا بن کر کسی نہ کسی طرح اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ سچ ہے

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا
(اقبال)

ایک منافق سے بڑھ کر اس حقیقت کو اور کون سمجھ سکتا ہے؟

وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴿۱۲﴾ (تم تباہ ہونے والے لوگ تھے)

یہ بات نہیں کہ تم سے اتفاقاً غلطی ہو گئی اور تم پیچھے رہ گئے، بلکہ تم جان بوجھ کر فیصلہ کر کے پیچھے رہے۔ تم نے ایک غلط پروگرام کو زندہ کرنے کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ لیکن ایک غلط پروگرام کو زندہ کرنے میں طاقت صرف کرنا اپنی محنت کو برباد کرنا ہے اور تمہاری حرکت ایسی ہی ہے۔

(۱۳) وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ (اور جو کوئی یقین نہ لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ تو ہم نے تیار کر رکھی ہے منکروں کے لئے دہکتی آگ)

حجاز کو پاک کیا جائے:

جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر اس طرح ایمان نہیں لاتا، جس طرح خالص مومنین ایمان لائے (جن کا ذکر آیت نمبر ۴ میں آ چکا ہے)، ان کے لئے کامیابی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تکلیفیں اٹھانا اور تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے آخر میں جلنا، یہ انکے لئے طے شدہ ہے۔

یہ حجاز میں رہنے والے مخالفین کے لئے ہے۔ ان کے لئے اس سرزمین میں رہنے کے لئے زندگی کی کوئی صورت نہیں چھوڑی گئی۔ سوائے اس کے کہ وہ اس طرح ایمان لے آئیں، جس طرح خالص مومنین ایمان لا چکے ہیں۔ چونکہ حجاز کو اس قرآنی انقلاب کا مرکز بنایا جانے والا ہے۔ اس لئے وہاں کی ارتجاعی طاقت کو زندہ رہنے کا موقعہ نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اب تک مسلمانوں میں یہ تخیل باقی ہے کہ حجاز میں خلاف اسلام کام کرنے کو بہت بڑا جرم مانتے ہیں۔ اس لئے کہ (ع) چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

(۱۴) وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۴
(آسمانوں اور زمین کا راج اللہ ہی کے لئے ہے، بخشے جسے چاہے اور عذاب میں ڈالے جسے چاہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے)

زمین پر اللہ کی بادشاہی:

آسمان کی بادشاہی تو فرشتوں کے ذریعے سے ہے، زمین کی بادشاہی اس جماعت کے ذریعے سے قائم ہو گی۔ وہ اللہ کے قانون کو زمین میں چلائیں گے۔

یہ انقلاب حضرت عثمانؓ کی شہادت تک رہا۔ اس وقت تک حجاز میں خدا کی بادشاہی قائم تھی۔ قرآن کا قانون تھا اور اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت تھی۔ وہ اپنے آپ کو قانون کا مالک نہیں سمجھتی تھی۔ بلکہ اپنے آپ کو خدا کا نائب سمجھ کر اس کے حکموں کو بجالاتی تھی۔ اور ان پر عمل کرتی کراتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے خود خدا کا نائب (خلیفۃ اللہ) بن کر اپنے ساتھیوں کو جو خدا کے قانون کی عزت اور وقار قائم کرنے میں آپ ﷺ کے شریک تھے، اپنے ذریعے سے خدا کا نائب (خلفیۃ) بنادیا۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (تاکہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب میں ڈالے)

جو شخص اس قانون کو جاری کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور درجہ بدرجہ ترقی کر کے قانون کی تعمیل کے قریب ہوتا جاتا ہے، اس کے گناہ معاف کر دئے جائیں گے۔ جو آدمی اس قانون سے ہٹتا اور درجہ بدرجہ پیچھے ہی ہٹتا جاتا ہے، اسے عذاب دیا جائے گا۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جماعت کے ذریعے سے جو نظام قائم کیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں ہر ایک صحیح کام کرنے والے آدمی کے گناہ بخشے جائیں اور اللہ کی رحمت سے وہ پروگرام سامنے لایا جائے جس میں انسانیت کی ترقی ہے۔

(۱۵) سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۵
(اب کہیں گے پیچھے رہ گئے ہوئے۔ جب تم چلو گے غنیمتیں لینے کو آؤ ہم بھی چلیں تمہارے ساتھ۔ چاہتے ہیں کہ بدل دیں اللہ کا کہا۔ تو کہہ دے کہ تم ہمارے ساتھ ہرگز نہ چلو گے۔ یونہی کہہ دیا اللہ نے پہلے سے۔ پھر اب کہیں گے نہیں تم تو جلتے ہو ہمارے فائدے سے۔ کوئی نہیں لیکن وہ تھوڑی بات سمجھتے ہیں)۔

اخلاقی فتح کے نتیجے :

جب مسلمان حدیبیہ سے واپس آئے تو خالی ہاتھ گھر آئے۔ یہ تو نہ تھا کہ کوئی فتح کر کے آئے، یا کوئی معرکہ مار کر آئے تھے اور وہی آکر لوگوں کو بتاتے کہ ہم نے یہ فتح حاصل کی۔ وہ معرکہ مارا۔ بلکہ یہ صرف اخلاقی فتح (Moral Victory) ہے۔ وہ لمبی مدت کے لئے نتیجہ خیز ہے۔ اور آہستہ آہستہ اپنے ثمرات دیتی رہے گی، مگر وہ اس وقت تو کوئی چیز ہاتھ میں لے کر نہیں آرہے۔ ان لوگوں کو وعدہ دیا گیا۔ کہ چند روز گھر میں رہ کر تیاری کرلو۔ اس کے بعد تمہیں خیبر جانا ہوگا۔ اور وہ سارا ملک تمہیں مل جائے گا جو غنیمت یہاں (اس سفر میں) چاہئے تھی اور نہیں ملی، اس کی جگہ خیبر کا وعدہ انہیں مدینہ پہنچنے سے پہلے دے دیا گیا۔ گویا ان کے پاس آج قیمتی مال نہیں ہے۔ لیکن کل کو مل رہے گا۔ ورنہ گھر جاکر بال بچوں کو سمجھانا کہ ہم فتح پاکر آئے ہیں، سخت مشکل ہے۔ چنانچہ چند روز کے بعد انہیں خیبر جانے کا حکم دیا گیا۔ اب جو لوگ حدیبیہ جانے سے رہ گے تھے ان کی رال ٹپکنے لگی۔ کہ ہم بھی ساتھ جائیں گے، انہیں جواب دیا گیا کہ تم نہیں جاسکتے۔ وہ کہنے لگے کہ ہاں صاحب! ہم سے تو حسد کیا جاتا ہے، اور ہمیں فائدہ حاصل کرنے سے روکا جاتا ہے۔ اس کا جواب دو کہ یہ بات نہیں ہے، تم خدا کی بات جھٹلانا چاہتے ہو۔ خدا نے حکم دیا ہے کہ ہم حدیبیہ والوں کو خیبر بطور انعام دیتے ہیں۔ تم لوگ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے خیبر میں شریک ہو کر خدا کی بات کیسے جھٹلا سکتے ہو؟ یہ تمہاری شرارت ہے تم اب نہیں جاسکتے۔

اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا (غنیمتوں کی طرف کہ تم انہیں حاصل کرو) یعنی خیبر کا مال غنیمت۔

كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ (اللہ نے پہلے ہی سے ایسا فرمادیا ہے)

خدا نے یہ حکم پہلے سے دے رکھا ہے۔ کہ حدیبیہ والوں کے سوا کوئی دوسرا اس معرکے میں شریک نہ ہوگا۔ اس کا اشارہ آیت نمبر ۱۰ کے آخری حصے میں آچکا ہے، جہاں ان مسلمانوں سے جنہوں نے بیعت کی تھی اجر عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔

بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾ (یہ لوگ بات پوری طرح سمجھتے ہی نہیں)

خیبر کی فتح کا بھید :

وہ بات کو پوری طرح نہیں سمجھتے۔ وہ دنیاوی نفع کی باتوں کو تو خوب سمجھتے ہیں۔ مگر نفع کے ملنے یا نہ ملنے کا حقیقی راز نہیں سمجھتے۔ خیبر یہودیوں سے چھین کر مسلمانوں کو مفت دینا تو مقصود نہیں۔ یہ دنیا کا ایک باغ ہے۔ جو یہودیوں کو ایک خاص خدمت پر مقرر ہونے کی وجہ سے دیا گیا تھا اور وہ خدمت یہ تھی کہ وہ حقیقی دین کو قائم

کریں۔ بعد میں انہوں نے نافرمانی کی۔ اب انہیں سزا دینا ہے۔ ایک دوسری قوم کو جو خدا کے حکموں کو فرشتوں کی طرح بجالاتی ہے یہ جنت ارضی (زمین کا باغ) دی جائے گی۔ جو شخص فرشتوں کی طرح کام نہ کرے اور وہ جنت چاہے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ احمق ہے، وہ بات ٹھیک طرح سے نہیں سمجھتا۔

کُل قومی انقلاب کی تیاری

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾

(پیچھے رہ جانے والے گنواروں سے کہہ دو کہ آئندہ تمہیں ایک قوم کے مقابلے میں بلائیں گے، جو بڑے سخت لڑاکو ہیں۔ یا تو تم ان سے لڑو گے، یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ پھر اگر تم حکم مانو گے تو اللہ تمہیں اچھا بدلہ دے گا اگر تم پلٹ جاؤ گے جیسے پہلی بار پلٹ گئے تھے تو تم کو دردناک عذاب دے گا۔)

آنے والا امتحان:

جب آپ ﷺ عمرے کے ارادے سے مدینہ منورہ سے تشریف لے جانے لگے، تو ﷺ آپ نے سب مسلمانوں کو شرکت کی دعوت دی۔ مگر بدووں نے سمجھا کہ یہ جو عمرے کو جارہے ہیں تو یہ چال ہے حقیقت میں لڑائی ہوگی اور یہ لوگ مارے جائیں گے۔ اس لئے بدو اس سفر میں ساتھ نہ ہوئے۔ پھر جب مسلمان صلح کر کے واپس آگئے تو یہ بدو لوگ بہت پریشان ہوئے کہ ہم نے ساتھ نہ جانے میں غلطی کی اور لگے طرح طرح کے بہانے اور عذر پیش کرنے، (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے) اب ان سے کہا گیا۔ اگر تم سچے ہو کہ تم ہمارے ساتھ جانے اور اس وقت آنے والے خطرات میں پڑنے کے لئے تیار تھے لیکن کسی غلطی سے پیچھے رہ گئے، تو ایک دفعہ بات گزر گئی تمہیں دوسرا موقعہ دیا جائے گا۔ اگر تم نے اس وقت کام پورا کیا تو جو غنیمت خیبر کے معرکے سے نہیں ملنے والی تھی وہ بھی دلا دی جائے گی۔

اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ (ایک جنگجو قوم)

قیصر و کسریٰ سے مقابلہ ہو گا:

"ایک جنگجو قوم" سے قیصر و کسریٰ کی بادشاہتیں مراد ہیں۔ ان کے مقابلے کے لئے اعراب کو دعوت دی جائے گی۔

تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْيُسْلِمُوْنَ (یا تو وہ تمہارے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے، یا وہ اطاعت اختیار کر لیں گے)

یا تو تم انہیں قتل کرو گے، یا وہ اطاعت اختیار کر لیں گے، یعنی بعض لوگ مارے جائیں گے اور باقی اطاعت قبول کر لیں گے۔ ان دو باتوں میں سے ایک ہو کر رہے گی۔

فَاِنْ تُطِيْعُوْا (اگر تم نے اطاعت کی)

اگر تم نے اس وقت اعلان جہاد کی اطاعت کی اور لڑائی میں شریک ہوئے

يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا (تو اللہ تمہیں اچھا بدلہ دے گا)

تو اللہ تعالیٰ تمہیں بہت اچھی مزدوری دے گا۔ یعنی بے اندازہ غنیمت ہاتھ آئے گی، جس سے اب کی کسر بھی نکل جائے گی۔

(۱۶) وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا

(اگر تم پلٹ گئے جیسے پہلے پلٹ گئے تھے، تو دردناک عذاب دے گا)

اگر تم پیچھے ہٹ گئے اور بے تیاری کئے بیٹھے رہے، جیسے اب حدیبیہ کے سفر سے ہٹ گئے تھے اور بے تیاری کئے بیٹھے رہے تھے تو تم کو سخت سزا دی جائے گی اور دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

امام ولی اللہ کے خیالات :

امام ولی اللہ دہلویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ :

"اجماع مفسرین کے مطابق اس آیت کے نزول کا موقع اور صحیح حدیثوں کے مضمون کے مطابق اس آیت کے آگے پیچھے کی آیات کا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ۶ ھ میں ارادہ فرمایا کہ عمرہ ادا کریں۔ چنانچہ آپ نے بدوؤں کو اور وادیوں میں بسنے والوں کو دعوت دی کہ وہ اس سفر میں آپ کے ساتھ چلیں۔ کیونکہ پختہ گمان تھا کہ قریش مکہ میں داخل ہونے سے روکیں گے اور بدر، احد اور خندق کی جنگوں میں قریش کے جو آدمی مارے گئے تھے، ان کے سبب سے ان کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ بھرا ہوا تھا۔ اس لئے خیال تھا کہ وہ کہیں جنگ کرنے کو آمادہ نہ ہو جائیں۔ ایسے حالات میں عقل کا تقاضا ہے کہ بہت سے آدمی ملکر جائیں، تاکہ قریش کے شر سے بچے رہیں۔ بہت سے بدوؤں نے آنحضرت ﷺ کی اس دعوت پر کان نہ دھرا اور سفر میں ساتھ نہ گئے۔ بعض گھر بار اور کاروبار کے جھگڑوں میں پھنسے رہے اور نہ جاسکے، مگر مخلص مسلمان جو ایمان کی بشاشت میں سرتاپا غرق تھے آپ کے ساتھ جانے کو سب سے بڑی نیکی سمجھ کر آپ کے ساتھ ہو گئے۔

جب یہ قافلہ حدیبیہ کے مقام کے قریب پہنچا تو قریش جاہلیت کی حمیت میں مبتلا ہو کر لڑنے کو تیار ہو گئے۔ قصہ مختصر وہاں مسلمانوں کو مغلوبانہ صلح کرنی پڑی۔ مکہ مکرمہ کے باہر ہی قربانیاں کیں اور واپس آ گئے۔ چونکہ عمرہ ادا نہ کر سکنے اور مغلوبانہ صلح کرنے کی وجہ سے یہ مخلص مسلمان بہت ہی غمزدہ تھے۔ حکمت الٰہی نے چاہا کہ ان کے دلوں کے زخموں کو بھر دے۔ چنانچہ انہیں خوشخبری دی گئی کہ تمہیں خیبر کا بہت سامال غنیمت ملے گا۔ اور اسے ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دیا جو حدیبیہ میں موجود تھے اور کسی کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت نہ دی گئی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ

(تم غنیمتوں کی طرف جاؤ گے تا کہ انہیں لو) تو یہ پیچھے رہنے والے کہیں گے، ہمیں اپنے ساتھ جانے دو۔ وہ اللہ کا فیصلہ بدلنا چاہتے ہیں تو کہہ دے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہ جاؤ گے۔ اللہ نے پہلے ہی سے یہ فرمایا ہے۔)

اور جس جماعت نے حدیبیہ میں بیعت کی، اس پر اللہ تعالیٰ اپنی خوشنودی کا اظہار کرتا ہوا فرماتا ہے کہ:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

(یقیناً اللہ خوش ہوا مومنوں سے جب وہ بیعت کرتے تھے تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے الخ)

اور اس بیعت سے ایک شخص جد بن قیس کے سوا جو منافق تھا اور کوئی نہ پھرا۔ بغویؒ وغیرہ نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے درخت کے نیچے میرے ہاتھ پر بیعت کی تھی وہ دوزخ میں نہ جائے گا۔ یہ مقام ان بہترین مقاموں میں سے ہے جہاں صحابہ کرام نے بلند مرتبے حاصل کئے اور وہ غنیمتیں حاصل کیں جو، کچھ عرصے کے بعد ان کے ہاتھ لگیں۔ مثلاً حنین کی غنیمتیں اور "دوسری غنیمتیں جن پر عرب کبھی قادر نہ ہوئے"۔ ان سے فارس اور روم کی غنیمتیں مراد ہیں۔ اس زمانے میں فارس اور روم کی وہ شوکت اور دبدبہ تھا اور لشکروں کی وہ کثرت تھی اور سامان جنگ کی وہ فراوانی تھی کہ عرب ان پر غلبہ پانے یا ان سے مال غنیمت حاصل کرنے کا خیال تک دل میں نہ لا سکتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً (اللہ تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کرتا ہے) یہ عرب کی غنیمتیں ہیں مثلاً حنین کے اموال غنیمت فعجل لكم هٰذه (پس جلدی کر دی تمہارے لئے یہ) یہ خیبر کی غنیمتیں ہیں جو حدیبیہ کے بعد ہی انہیں حاصل ہوئیں۔ وَّ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا (اور دوسری وہ جن پر تم نے قدرت نہ پائی) یہ فارس اور روم کی غنیمتیں ہیں۔

اس کے علاوہ حکمت الٰہی نے تقاضا کیا کہ جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے انہیں دھمکائے اور ان کی فضیحت کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قل للمخلفين (الآیہ) اور جنگجو قوموں کے ساتھ جنگ کرنے کی دعوت پہلے ہی سے

دے دے۔ تاکہ وہ دعوت قبول کرنے نہ کرنے پر خوب غور کرلیں اور پہلے ہی بصیرت حاصل کرلیں اور طرح طرح کے عقلی قیاسات ان کے حال کو پریشان نہ کردیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ستدعون (تم کو عنقریب بلایا جائے گا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدوؤں کو کفار کے ساتھ جہاد کرنے کے لئے بلایا جائے گا۔ دیہ دعوت ان پر شرعی ذمہ داری ڈال دے گی۔ اگر وہ اس دعوت پر لبیک کہیں گے تو ثواب پائیں گے اور اگر اسے قبول نہ کریں گے تو عذاب پائیں گے۔'' (ازالۃ الخفا مقصد ص ۳۸)

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾

(اندھے پر تکلیف نہیں اور نہ لنگڑے پر تکلیف ہے اور نہ بیمار پر تکلیف ہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے اسے باغوں میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اور جو کوئی پلٹ جائے اسے دردناک عذاب دے گا)

اجماعی جنگ :

یہ جو دعوت دی جارہی ہے کہ آئندہ جنگوں میں شریک ہو، یہ صرف اعراب (بدوؤں) کو دعوت نہیں دی جارہی، بلکہ قرآن کے ہر ایک ماننے والے کا فرض ہے کہ جنگوں میں شریک ہو۔ تیاری کے اس حکم سے کوئی شخص بھی باہر نہیں ہے، البتہ اندھے، لنگڑے اور مریض کو تکلیف نہیں دی جاتی کہ وہ میدان جنگ میں جاکر ہی جنگ میں شامل ہو۔

اعمیٰ (اندھے) اعرجؔ (لنگڑے) اور مریض (بیمار) کے متعلق سورہ توبہ کی آیت نمبر ۹۱ سامنے رکھنی چاہئے جس کے الفاظ یہ ہیں :

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

(یعنی ضعیفوں اور بیماروں پر اور ناداروں پر جنکے پاس خرچ کرنے کو نہیں ہے کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کرتے رہیں)

ابوبکر جصاصؒ کا قول :

سورہ توبہ کی ایک آیت [1] کی تفسیر کرتے ہوئے امام ابوبکر جصاص الرازی الحنفی جو چوتھی صدی ہجری کے

---

[1] وہ آیت یہ ہے : اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (التوبہ : ۴۱) (نکلو ہلکے اور بوجھل اور لڑو، اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں) (مرتب)

نامور فاضل ہیں لکھتے ہیں کہ :

وقوله، وجاهدوا باموالكم وانفسكم فى سبيل الله) فاوجب فرض الجهاد بالمال والنفس جميعا: فمن كان له مال وهو مريض او مقعد اوضعيف لايصلح للقتال فعليه الجهاد بماله بان يعطيه غير فيغزوبه۔

(۱) جو شخص مالدار ہو اور بیمار یا بیٹھنے ہی کے قابل ہو یا کمزور ہونے کی وجہ سے جنگ کے ناقابل اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے مال سے جہاد کرے یعنی کسی شخص کو (جس کے پاس مال نہ ہو) مال دے دے۔ کہ وہ اس کے ذریعے سے جہاد کرے۔

كما ان من له قوة وجلد اوامكنه الجهاد بنفسه كان عليه الجهاد بنفسه، وان لم يكن ذا مال ويسار لعد ان يجد مايبلغه.

(۲) جو شخص مالدار نہ ہو لیکن وہ خود جہاد کر سکتا ہو اور مقام جنگ پر پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو تو وہ خود جہاد کرے یہ اس کا فرض ہے۔

ومن قوى على القتال وله مال فعليه الجهاد بالنفس والمال۔

(۳) جو شخص تندرست بھی ہو اور مالدار بھی ہو وہ مال اور جان دونوں سے جہاد کرے اس کا یہی فرض ہے۔

ومن كان عاجزاً بنفسه معدما فعليه الجهاد بالنصح لله ولرسوله بقوله (لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ) (احکام القرآن، الجزاء الثالث ص۱۱۷)

(۴) جو شخص جسمانی لحاظ سے عاجز ہو اور مفلس بھی ہو تو اس آیت لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کے مطابق اس پر کم سے کم یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے حق میں خیر خواہی کرتا رہے۔ (یعنی بری خبریں نہ خود پھیلائے نہ حتی الامکان ایسی خبروں کو پھیلنے دے، بلکہ انکی تردید کرتا رہے۔ غرض اس سے جو بطور اصلاح بن پڑے اس میں کوتاہی نہ کرے)

”یعنی خدا تعالیٰ کے اس حکم ”وجاهدوا باموالكم وانفسكم فى سبيل الله“ نے جہاد کا فرض مال اور جان دونوں سے ادا کرنا واجب کر دیا ہے۔

امام الحکمۃ امام ولی اللہ دہلویؒ ''حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم ص ۱۷۴ میں فرماتے ہیں کہ :

واذا اراد الخروج للغزو عرض جيشه يتعاهد الخيل والرجال فلا يقبل من دون خمس عشرة سنة كما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يفعل ذالك لا مخذلا وهو الذى يقعد الناس عن الغزو [1] ولا مرجفا وهو الذى

[1] گویا حضرت امامؒ کے نزدیک نام نہاد امن پسندوں (Pecifists) کی تحریک کا معاشرہ انسانی میں کوئی مقام نہیں، اگرچہ اس سے یہ نتیجہ پیدا ہو کہ لوگ حق کی حمایت میں لڑنے سے باز رہیں۔ (مرتب)

یحدث بقوۃ الکفار

(یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کسی جنگ پر تشریف لے جانے کے لئے نکلتے تو سارے لشکر کا جائزہ لیتے، چنانچہ آپ ﷺ پندرہ سال سے کم عمر کے لڑکوں کو لشکر میں شامل نہ فرماتے اور نہ مخذل اور مرجف کو ساتھ لیتے۔ مخذل وہ ہے جو لوگوں کو جنگ سے باز رکھے اور مرجف وہ ہے جو دشمن کے لشکر کی قوت اور طاقت بیان کر کے لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرے)

اب اگر یہ اندھے اور لنگڑے وغیرہ مخذل اور مرجف ہیں تو کیا وہ خدا اور رسول کے خیر خواہ ہو سکتے ہیں؟ ان کے خیر خواہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم اتنا کام ضروری کریں کہ لوگوں کو لڑنے کی ترغیب دیتے رہیں۔ اور کفار کے زور کی جو باتیں ہوں، ان کی تردید کرتے رہیں۔ اور مسلمانوں کی کمزوریوں کو چھپائیں۔ گویا اس چوتھی جماعت (Category) کے لئے بھی جو نہ صحت سے مالامال ہیں۔ نہ مالدار ہیں۔ پراپیگنڈہ کرنے میں حصہ لینا فرض قرار دیا گیا ہے۔ آج کی دنیا جانتی ہے کہ جنگ میں پراپیگنڈہ نصف سے زیادہ طاقت کا مالک ہے۔ اس اصول پر کوئی شخص بھی جہاد سے فارغ نہیں ہو سکتا۔

گویا قرآن کے نزدیک جنگ اجماعی چیز (Total War) ہے، جس میں جہاں تک طاقت ہو اس میں حصہ لے۔ کوئی مرد اور عورت تندرست اور بیمار اس سے الگ نہیں رہ سکتا۔

لڑنے والی طاقت (Battle Force) کو سامان جنگ اور روٹی کپڑا وغیرہ بہم پہنچانا اور ملک کے انتظام کے لئے پیچھے سے نظام خانگی (Home Front) کو قائم رکھنا جنگ جیتنے کے لئے ضروری ہے۔ ہماری عورتیں اور بچے، مریض اندھے اور لولے لنگڑے ہوم فرنٹ (Home Front) کے کام میں مصروف رہیں گے۔

وہ کیسے مسلمان ہیں جو عذروں کی بناء پر جہاد سے الگ رہنا چاہتے ہیں؟ میرے استاد (شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ) فرما چکے ہیں کہ تم اکیلے جہاد کر سکتے ہو۔ اور دنیا پر فتح پا سکتے ہو۔ افسوس ہے کہ ہمارے استادؒ کے ارشاد کے لئے جس سند کی ضرورت تھی، وہ وقت پر ہاتھ نہ آ سکی۔[1] ورنہ ہماری دیوبندی جماعت میں سے سوائے اس شخص کے جو سچ مچ منافق ہو تا کوئی پیچھے نہ رہتا۔ اب ضرورت ہے کہ اس جماعت میں سے نفاق کو دور کیا جائے۔ جو جہاد کے لئے تیار نہیں ہے، وہ کیوں میرے استاد کی جگہ پر بیٹھتا ہے؟ اسے اس جگہ سے ہٹا دیا جائے۔

غرض، "اولی باسٍ شدیدٍ" (سخت جنگجو لوگوں) سے لڑنا پڑے گا۔ ان سے یہ لڑائی قیامت تک جاری رہے گی۔ اس مقابلے کے متعلق قرآن حکیم کی کوئی آیت کبھی منسوخ نہیں ہو سکتی۔ اور بھرتی کے متعلق مذکورہ بالا حکم پر

---

[1] یعنی جصاص الرازیؒ کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر (مرتب)

عمومی اور دائمی حیثیت رکھتا ہے۔

وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ یُدۡخِلۡہُ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ

(جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے گا، اسے اللہ باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں)

دنیا اور آخرت کی زندگی کا تسلسل :

اس حصہ آیت میں خالدین (ہمیشہ) کا لفظ نہیں ہے۔ اس لئے اس سے مراد دنیا کی جنات ہیں۔ جہاں خالدین کا لفظ آئے گا وہاں مراد یہ ہوگی کہ مومن اس دنیا کے باغوں سے نکل کر سیدھے ان جنات میں پہنچ جائیں گے جو دائمی (خالدین) ہیں۔

ایک شخص (مثلاً فرعون) دنیا میں غرق کر دیا گیا اور اس کے بعد ہی عذاب میں ڈال دیا گیا گویا اس کا عذاب لگاتار رہا اور اس عذاب کو خلود (ہیشگی) حاصل ہوگیا۔ ہیشگی کے باغات میں داخلہ بھی اسی طرح ہوگا کہ یہاں دنیا میں حکومت امن اطمینان و راحت کی زندگی بسر کرتے ہوئے خدا کی راہ میں شہید ہوئے تو سیدھے جنات عدن (ہیشگی کے باغات) میں پہنچ گئے۔

وَ مَنۡ یَّتَوَلَّ یُعَذِّبۡہُ عَذَابًا اَلِیۡمًا (جو شخص پیٹھ پھیرے گا، اسے دردناک عذاب دیا جائے)

غلامی کا عذاب :

جو لوگ ہمت اور طاقت کے باوجود جہاد میں حصہ نہیں لیں گے، انہیں دوسری قوم کی غلامی کے عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا اور جو لوگ اس عذاب غلامی میں مبتلا ہونے کے باوجود اس سے بچنے کی پوری کوشش نہ کریں گے، انہیں اس میں مبتلا رکھا جائے گا۔

افسوس ہے اس قوم کے حال پر جو غلامی کا احساس بھی کھو بیٹھے اور بڑے اطمینان سے غیر فکر کی حکومت کا جُوا برداشت کرتی رہے! اس کے عوام انقلاب یا جہاد میں کیا حصہ لے سکتے ہیں؟

صلح حدیبیہ میں ایک بھید

(۱۸) لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ یُبَایِعُوۡنَکَ تَحۡتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ فَاَنۡزَلَ السَّکِیۡنَۃَ عَلَیۡہِمۡ وَ اَثَابَہُمۡ فَتۡحًا قَرِیۡبًا

(یقیناً اللہ خوش ہوا مومنوں سے جب وہ بیعت کرنے لگے، اس درخت کے نیچے پھر ان کے دلوں میں جو تھا وہ اللہ نے معلوم کیا، پھر اتارا ان پر اطمینان اور انعام دیا قریبی فتح کا)

موت سے مصافحہ :

جب حدیبیہ میں آنحضرت ﷺ کے سفیر حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کی افواہ پہنچی۔ رسول اکرم ﷺ نے سب صحابہ کو بلا کر موت پر بیعت طلب کی۔ سب نے بن پوچھے بیعت کرلی۔ یہ بیعت ایک درخت کے نیچے لی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خداوند تعالیٰ نے آنے والی خونریز جنگوں کے پیش نظر مسلمانوں کو موت کے لئے تیار کرنا شروع کردیا تھا۔ جو جماعت اہل مکہ کے مقابلے میں موت قبول کرلیتی ہے کیا، وہ قیصر و کسریٰ سے مذاق کرنے جائے گی؟ سلطان محمد کی فوج قسطنطنیہ کے بادشاہ کے مقابلے میں کھیلنے کے لئے گئی تھی یا موت سے ہاتھ ملانے؟ واقعہ یہ ہے کہ جس دن سے مسلمانوں نے موت قبول کرنے کا یہ فکر چھوڑا ہے، اسی دن سے ان کی حکومتیں برباد ہونے لگی ہیں۔ اب ہم اس حالت کو دیر تک برداشت نہیں کرسکتے۔ ہماری زندگی ایک دردناک عذاب میں مبتلا ہے، اب ہم اپنے ملک میں اپنی مضبوط حکومت بنائے بغیر دم نہیں لے سکتے، اب ہمیں بین الاقوامی جھگڑوں میں زیادہ دیر تک پھنسا کر منتظر نہیں رکھا جاسکتا۔ اور نہ ہم مخذلوں کی اطاعت کرسکتے ہیں، کوئی پیر ہو، کوئی لیڈر ہو، کوئی حاکم ہو، وہ اپنے اپنے گھر جا کر مریں۔ اب ہمارے سر پر حکومت چلانا چھوڑ دیں۔ اب ہم ان کی نہیں سن سکتے۔ اب ہمیں اپنے ملک میں اپنی طاقت سے اپنی حکومت چلانی ہوگی۔ اس کے پروگرام پر غور کر کے اس کی مدات کو آگے پیچھے کرنا ہمارا کام ہوگا۔ اب ہم کسی ایسے آدمی کی جو ہماری مصیبت میں شریک نہ ہو کوئی تجویز یا مشورہ سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اب ہم اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ ہم خلافت باطنہ کی مدد سے خلافت ظاہرہ کے قیام کے ساتھ اپنا قدم آگے بڑھا سکتے ہیں۔ ہم اس اصول کو نہایت خوشی کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہمیں حضرت نبی اکرم ﷺ کی جماعت کے اس طریق تنظیم کی تفصیل امام ولی اللہ دہلوی کی کتابوں میں مل گئی۔ یہ ہماری ضرورت تھی جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہماری رہنمائی فرمائی۔ جو شخص ہماری مصیبت میں ہمارا شریک نہیں ہے، وہ بھلا ہماری ضرورت کو کیا سمجھ سکتا ہے؟ ہماری سکیم میں ایک زبان بولنے والا گروہ جو کلچر میں ایک قسم کی یک رنگی رکھتا ہے ایک اکائی ہے، جو شخص ان کی زبان نہیں بولتا وہ ان کی مصیبت میں شریک بھی نہیں ہوسکتا۔

قومی حکومت :

ملک کے ایک مستقل ٹکڑے میں جس میں ایک زبان بولنے والا گروہ رہتا ہے۔ اور جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، ہماری فقط یہ کوشش ہے کہ یہ اکثریت قانون سازی کی طاقت کی مالک بن جائے اور اس کے ووٹ کے بغیر وہاں کوئی حکومت نہ چل سکے۔ اس کے لئے ہمیں اس کی اکثریت کو تعلیم دینی ہوگی۔ اسے مختلف سیاسی

مسالک فکر (Schools of Politics) سمجھا کر اپنا مسلک معین کرنا ہوگا۔ جب ہم اس پروگرام سے فارغ ہو جائیں گے تو ہمیں کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

(بے شک اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب وہ تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔اس درخت کے نیچے)

اللہ کا اظہار خوشنودی:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اظہار خوشنودی ان کے موت قبول کرنے پر ہوا ہے۔ان لوگوں نے جس ضبط اور قربانی کا اظہار کیا ہے، وہ یقیناً قابل فخر ہے، کوئی جماعت اس اعلیٰ درجے کے ضبط اور قربانی کے بغیر کامیابی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے نمونے کی پیروی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور یہ ہر اس جماعت کے لئے جو کامیابی کی خواہش کرے قیامت تک نمونے کی جماعت رہے گی۔

فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ (جو کچھ ان کے دلوں میں تھا،اللہ اسے جانتا تھا)

یعنی وہ گھٹا ہوا جوش اور طاقتور ہونے کے باوجود مغلوبانہ صلح کے ماننے پر مجبور ہونے سے پیدا ہونے والے جذبات، جو ڈیڑھ ہزار کی عظیم الشان منظّم جماعت کے دلوں میں اندر ہی اندر لہریں مار رہے تھے۔

فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ (ان پر اطمینان اتارا)

محض جوش کافی نہیں:

محض جوش کامیابی کا کفیل نہیں ہو سکتا، محض جذبہ قربانی منزل مقصود تک پہنچانے کی ہمیشہ کی گارنٹی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ٹھنڈے دل سے سوچنے اور غور کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنگ و صلح کی مصلحتوں پر غور کرنے میں مدد دینے والی فضا پیدا کر کے ان کے دلوں کو سکون بخشا، انہیں موت قبول کرنے میں کوئی تشویش پیدا ہی نہیں ہوئی۔ اس لئے ان کا موت قبول کرنے کا جذبہ عارضی ہیجانی حالت کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ سوچا سمجھا ہوا فیصلہ ہے جس پر انہیں پورا پورا اطمینان ہے۔ اس قسم کے فیصلے سے ایک مستقل مزاج جماعت کبھی نہیں پھرا کرتی۔

وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا (اور انہیں قریبی فتح کا بدلہ دیا)

خیبر کی فتح کا وعدہ :

انہیں یہاں لوٹ سے روک کر خیبر کی جنگ میں کامیابی کا یقین دلایا۔

(۱۹) وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا (اور بے شمار غنیمتیں جو وہ لیں گے)۔

اور ان سے یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ انہیں خیبر میں بہت سا مال ہاتھ آئے گا۔ چنانچہ حدیبیہ سے واپس ہونے پر آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کی اس جماعت نے جو حدیبیہ میں آپ ﷺ کے ساتھ تھی تین ہفتے کے قریب مدینے میں قیام کیا اور پھر خیبر پر دھاوا بول دیا۔ وہاں سے بہت مال ہاتھ آیا۔

(ب) وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾ (اور اللہ عزت دینے والا حکمت دینے والا ہے)

"عزت دینے" کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سلطنت اتنی مضبوط اور وسیع بنادے گا کہ کوئی ان پر حملہ نہ کر سکے گا، ظاہر ہے کہ اتنی بڑی سلطنت بہت سی قوموں کے ساتھ لڑ کر اور فتح پا کر ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۲۰) (ا) وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا (اللہ نے تمہیں وعدہ دیا بہت سی غنیمتوں کا جو تم لوگے)

اللہ نے تم سے وعدہ کیا۔ کہ تم بہت سی غنیمتیں حاصل کرو گے۔

(ب) فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ "اس نے یہ (خیبر کی فتح) قریب کردی تمہارے لئے"۔

یعنی خیبر کی فتح جلد ملے گی، اس کے بعد درجہ بدرجہ دوسری فتوحات حاصل ہوتی رہیں گی۔

(ج) وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ (اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے)

وہ تم سے مقابلہ نہ کر سکیں گے۔

(د) وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (تاکہ یہ مومنوں کے لئے ایک نشانی ہو)

یہ بات مومنوں کے لئے ایک نشانی ہوگی۔ کہ اگر ہم موت کے لئے تیار ہو گئے، تو لوگوں کے ہاتھ رک جائیں گے۔ اور وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ جیسے حدیبیہ اور خیبر میں ہوا۔

(ہ) وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (اور تمہیں سیدھی راہ پر چلائے گا)

تمہیں انسانیت کی بنیادی ہدایت عطا کی جائے گی، جس کی آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک تمام نبی دعوت دیتے چلے آئے ہیں اور تمہیں اس کل قومی قانون کے چلانے کی طاقت دی جائے گی۔

(۲۱) (ا) وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا (اور ایک اور فتح جو تمہارے بس میں نہیں آئی)

روم اور ایران کی فتوحات کا وعدہ :

تم نے ابھی ایران اور روم سے لڑنے کی تیاری نہیں کی، جب تم اس جنگ کے قابل ہو جاؤ گے، تو اور غنیمتیں

بھی حاصل کروگے۔

(ب) قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ﴿۲۱﴾

"وہ (فتح) اللہ کے قابو میں ہے اور اللہ ہر بات پر قدرت رکھنے والا ہے"

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم ان کے مقابلے کے لئے بھی تیار ہو جاؤ گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حدیبیہ کے واقعے تک اپنی قومی تنظیم کر چکے تھے۔ اب انہیں بین الاقوامی غلبہ حاصل کرنے کے لئے تیاری کرنے کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

(۲۲) (الف) وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ (اگر کافر تم سے لڑتے تو وہ ضرور پیٹھ پھیر جاتے) اس وقت کافر نہیں لڑے۔ گو بعض لوگ لڑنا چاہتے تھے، اگر وہ لڑتے تو انہیں شکست ہوتی۔

(ب) ثُمَّ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۲۲﴾ (پھر وہ کوئی حمایتی اور مددگار نہ پاتے)

انہیں کسی قبیلے کی طرف سے مدد نہ ملتی۔

(۲۳) سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ﴿۲۳﴾

(اللہ کی یہی سنت ہے اور یہ پہلے سے چلی آتی ہے تو اللہ کے اس قاعدے کو بدلتے ہرگز نہ پائے گا)

نبی کے مقابلے میں کافروں کا شکست کھانا قانون الٰہی ہے۔ یہ کبھی نہیں بدلتا۔ اسی طرح نبی کی تعلیم پر چلنے والی قوم بھی کبھی شکست نہیں کھا سکتی۔

(۲۴) وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا ﴿۲۴﴾ (اور وہی ہے جس نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے مکے کی گھاٹی میں روک رکھے بعد اس کے کہ تمہارے ہاتھ لگا دیا انہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے اللہ دیکھتا ہے)

اس سفر میں جنگ نہ ہونے کی وجہ :

چند آدمی لڑنے کی کوشش کرنے کے لئے آئے تو دونوں جماعتوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے روک دئے گئے۔ اہل مکہ ڈر گئے اور انہوں نے مسلمانوں کا غلبہ مان لیا اور مسلمانوں کو نبی اکرم ﷺ کی حکمت عملی نے روک رکھا۔ اور لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

(۲۵) (ا) هُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْهَدْیَ مَعْكُوْفًا اَنْ یَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ، (یہی وہ لوگ ہیں، جنہوں نے انکار کیا اور تمہیں مسجد حرام سے روکا اور نیاز کی قربانی بند پڑی رہ گئی اس بات سے کہ اپنی جگہ پہنچے)

یہ لوگ مجرم تھے، انہوں نے قرآن کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ مسجد حرام سے روکا۔ اور ھدی (قربانی) کو اپنے مقام پر پہنچنے نہ دیا۔ یہ حقیقت میں شکست کے مستحق تھے۔ ان کی شرارت کے باوجود انہیں شکست کیوں نہ دلائی گئی؟

(ب) وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ

(اگر نہ ہوتے کتنے ایک مرد ایمان والے اور عورتیں ایمان والیاں جن کا تمہیں علم نہیں تھا کہ تم انہیں پیس ڈالتے۔ پھر تم پر ان کی وجہ سے خرابی پڑتی بے خبری سے)

بات یہ ہے کہ چند کمزور اور محتاج مرد اور عورتیں جو ایمان والے ہیں [1] مکے میں موجود ہیں۔ وہ اپنا ایمان ظاہر نہیں کر سکتے۔ تم میں سے عام مسلمان انہیں نہیں جانتے۔ اگر لڑائی ہوتی تو انہیں بھی کفار کی طرف سے شریک ہو کر خواہ مخواہ تم سے لڑنا پڑتا اور وہ مارے جاتے۔ یا اگر وہ اس سے انکار کرتے تو خود کفار انہیں قتل کر ڈالتے۔ دونوں صورتوں میں وہ مقصد جس کے لئے تم کھڑے ہوئے ہو یعنی دنیا سے ظلم دور کرنا بے خبری میں خود تمہارے ہاتھوں برباد ہو جاتا۔ اس طرح تمہیں بھی نقصان پہنچتا انہیں بھی۔

جنگ مقصود اصلی نہیں:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کے نزدیک لڑنے کا اصل مقصد جنگ کرنا نہیں ہے، اصل مطلب مظلوموں سے ظلم دور کرنا ہے، چاہے وہ جنگ کے ذریعے سے ہو یا جنگ کو روک کر۔ اگر لڑائی سے ظلم زیادہ ہو جانے کا ڈر ہو تو لڑائی روک دی جائے گی، اگر صلح سے ظلم دور ہوتا ہو تو صلح کر لی جائے گی، چاہے وہ کیسی بھی کمزور شرطوں پر کیوں نہ کرنی پڑے۔

حکمت قرآنی کا ایک نکتہ:

حکمت قرآنی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک قوم میں اس قوم کے لوگوں کے ہاتھوں انقلاب لایا جائے۔ چنانچہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے یہی طریق اختیار کیا۔ اس کی تفصیل حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان

---

[1] چنانچہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے حضرت عثمان غنیؓ کو قریش کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تو انہیں یہ بھی حکم دیا کہ مکے میں جو مسلمان مرد اور عورتیں مومن ہیں ان سے مل کر انہیں فتح کی خوشخبری دیں اور انہیں خبر دے دیں کہ عنقریب اللہ تعالیٰ مکہ مکرمہ میں اسلام کو غلبہ عطا فرمائے گا پھر وہاں ایمان پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔" (زاد المعاد جلد دوم ص ۱۳۳)

فرمائی ہے۔ [1] آپ فرماتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار کا پہلا طبقہ قریش اور ان کے ارد گرد کے قبیلوں کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنا۔ اس کے بعد اللہ نے ان کے ہاتھوں عراق اور شام فتح کرائے۔ [2] پھر ان کے ہاتھوں فارس اور روم فتح کرائے [3] پھر ان کے ہاتھوں ہند، ترکستان اور سوڈان فتح ہوئے۔ [4]

خود قرآن حکیم میں بھی اس حکمت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ چنانچہ سورہ صف کے آخر میں ہے کہ :

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾

(یعنی اے ایمان والو! تم اللہ کے مددگار بن جاؤ۔ جیسے عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہا کہ کون ہے جو میری مدد اللہ کی راہ میں کرے؟ حواری بولے ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ چنانچہ (ان کی کوششوں سے) بنی اسرائیل کا ایک فرقہ ایمان لے آیا اور ایک فرقہ منکر ہی رہا۔ پھر ہم نے بنی اسرائیل کے ایمان لانے والے طبقے کو قوت دی ان کے دشمنوں پر اور وہ غالب آئے)

گویا بنی اسرائیل کے اندر کام کرنے والی جماعت کی کوشش سے اس قوم کے اندر انقلاب لایا گیا۔ اور یہ طبعی بات بھی ہے کیونکہ عرب اٹھ کر چینیوں میں انقلابی تحریک نہیں پھیلا سکتے۔ انقلاب لانے کے لئے ہر قوم میں وہی لوگ کام کر سکتے ہیں، جو اس قوم کی زبان اور معاشرت میں شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے عربوں میں عربی بولنے والی جماعت کے ذریعہ سے انقلاب پھیلایا اور ایران میں فارسی بولنے والوں کے ذریعے سے۔ گو انقلاب کی ابتدائی تعلیم دینے والے عرب ہی تھے۔ اب ہندوستان میں بھی ہر ایک مسلم لسانی گروہ میں اسی طرح الگ الگ انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔

(ج) لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

(تاکہ اللہ داخل کرے اپنی رحمت میں جسے چاہے)

---

[1] جلد دوم باب الجہاد

[2] عراق اور شام میں ملی جلی قومیں بستی تھیں، ان میں عرب بھی تھے، ان عربوں کو ساتھ ملا کر عراق اور شام میں انقلاب برپا کیا گیا۔ ہمارے زمانے میں اس کی مثال آذربائیجان کے انقلاب کی ہے، جس میں روسیوں کا ہاتھ تھا۔ لیکن انقلاب کرنے والے آذربائیجانی خود تھے۔ روسیوں نے ان ایرانیوں سے کام لیا جن کا تعلق روسی علاقے میں بسنے والے ایرانیوں سے تھا (مرتب)

[3] یعنی اہل عراق کے ہاتھوں فارس کو فتح کرایا۔ کیونکہ ان کا تعلق ایران کے ساتھ تھا اور اہل شام کے ہاتھوں روم کو فتح کردیا۔ کیونکہ شامیوں کا تعلق رومیوں کے ساتھ تھا۔ (مرتب)

[4] چنانچہ ایرانیوں نے ہندوستان اور ترکستان فتح کئے اور رومیوں کے ہاتھوں حبشہ فتح ہوا کیونکہ ان کا آپس میں تعلق تھا۔ (مرتب)

اللہ کی رحمت میں داخل ہونے والی جماعتیں :

قرآن حکیم کو ایسی ہی جماعت کی ضرورت تھی جو اپنا فکر چلانے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی ظاہری شکست کو جس کی مصلحت امام اور اس کا مشیر خاص یعنی صدیق اکبرؓ ہی سمجھتا تھا قبول کر کے اس امام کی اطاعت پر قائم رہے۔ اسی قوت اطاعت نے انہیں آگے چل کر تمام دوسرے دینوں کے ماننے والوں پر غلبہ عطا کر دیا۔ اس قسم کا نظام اطاعت نہ یہودیوں میں موجود تھا نہ عیسائیوں میں۔ مجوسیت بھی اس سے خالی تھی اور دوسرے دین والے بھی اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز تھے۔ یہ اللہ کا فضل تھا کہ اس نے بنی اسماعیل کی اس چھوٹی سی جماعت کو اپنی رحمت میں شامل کر کے انہیں ایسی شاندار طاقت ضبط عطا کی۔

دوسری جماعت جسے اللہ نے اپنی رحمت میں جگہ دی، مسلمانوں کی وہ خفیہ جماعتیں تھیں جو مکہ معظّمہ میں موجود تھیں۔ اب صلح کے بعد انہیں اپنے اظہار کا موقعہ مل جائے گا۔

اللہ کی رحمت سے فائدہ اٹھانے والی تیسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو اس صلح کے بعد مسلمانوں سے میل جول پیدا کریں گے اور ان سے اثر لے کر اسلام قبول کرلیں گے اور ان کے بعد وہ قومیں ہوں گی جو اسلام قبول کر کے قیامت تک قرآن کی خدمت کرتی رہیں گی۔

(و) لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (اگر وہ لوگ ایک طرف ہو جاتے تو ان میں سے جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا تھا انہیں ہم ضرور دردناک عذاب دیتے)

لڑائی کیوں رکی؟ :

اگر وہ کمزور ایک طرف ہو جاتے تو ہم ان کافروں کو سخت عذاب دیتے۔ اور انہیں خوب پٹواتے۔ لیکن اب وہ مظلوم بھی ان کافروں میں ملے جلے موجود ہیں۔ اگر لڑائی ہوتی تو وہ بھی پٹ جاتے۔ اس لئے لڑائی روک دی گئی۔

(۲۶) (ا) اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

(جب کافروں نے جاہلی کد اپنے دل میں رکھی تو اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اطمینان اتار دیا)

جب لڑائی ٹلنے کا فیصلہ معلوم ہو گیا تو کافر جاہلیت کی حمیت میں ان سے شرطیں منوانے بیٹھ گئے۔ ممکن تھا کہ ان شرطوں کی سختی ہی کی وجہ سے لڑائی ہو جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور مؤمنوں پر دل کا اطمینان نازل کیا، اور بڑے سکون سے بیٹھے رہے۔ اور انہوں نے وہ سب شرطیں مان لیں اور جاہلیت کے ان حامیوں کو موقعہ نہ دیا کہ لڑائی چھیڑیں۔

(ب) وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى (انہیں انصاف کی بات پر قائم رکھا)

ان مؤمنوں کا طریقہ یہ رہا کہ ابراہیمی دین کے احترام کے لئے انہوں نے سب کچھ قبول کرلیا۔ اگر لڑائی میں مومنوں کی طرف سے نفسانیت مقصود ہوتی تو جیسے کافر چڑا رہے تھے یہ ضرور لڑ پڑتے، لیکن یہ اپنی انصاف کی بات پر جمے رہے۔

(ج) وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا (اور وہی انصاف کے زیادہ لائق اور قابل تھے)

یہ انصاف قائم کرنے کے زیادہ مستحق ہیں۔ کیونکہ یہ انصاف کی خاطر لڑتے ہیں اور انصاف ہی کی خاطر (ضرورت پڑے تو) دب کر بھی صلح کرتے ہیں۔ وہ جاہل جو ملت حنیفی کی شکل ہی شکل لئے بیٹھے ہیں اور مر رہے ہیں اقتدار پر، انصاف کیا قائم کریں گے؟

(د) وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۲۶﴾ (اللہ ہر ایک بات جانتا ہے)

اس نے جو لڑائی روکنے کا حکم دیا ہے تو بھی علم ہی پر مبنی ہے۔ اور وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کونسی زیادہ اس قابل ہے کہ حق قائم کرسکے۔

قرآنی انقلاب کا نصب العین

(۲۷) لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ

(اللہ نے سچ دکھایا اپنے رسول کو خواب، تحقیق تم ضرور داخل ہوگے مسجد حرام میں، اگر اللہ نے چاہا آرام سے، بال مونڈتے ہوئے اپنے سروں کے اور کترتے ہوئے، بے کھٹکے)

نبی اکرم ﷺ کا خواب:

اب واقعے کا مختصر بیان آتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے خواب دیکھا کہ ہم مکے میں پہنچے ہیں۔ عمرہ ادا کیا ہے۔ کوئی بال منڈا رہا ہے۔ کوئی چھوٹے کرا رہا ہے۔ اور سب امن و امان سے وہاں بیٹھے ہیں۔ مہاجرین کی جماعت یہ خواب سن کر بے تاب ہوگئی۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ وحی ہے۔ اس یقین کے ساتھ لوگوں نے مکہ جانے کی تیاری کرلی۔ آپ ﷺ بھی تیار ہوکر عمرے کے لئے آگئے۔ مگر حدیبیہ کے مقام پر کفار نے روک دیا۔ اور آپ رک بھی

گئے۔ اس پر لوگوں کے دلوں میں شبہ پیدا ہوا کہ یہ کیا ہوا؟ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال ہوگا؟ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر ہوگا اور ضرور ہوگا اس آیت میں اسی خواب کا ذکر ہے۔

اٰمِنِیْنَ امن وامان سے بغیر لڑے بھڑے داخل ہو جاؤ گے۔

لَا تَخَافُوْنَ تمہیں یہ خوف نہ ہوگا کہ تمہیں کوئی وہاں سے نکال دے۔

(ب) فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا (اسے معلوم تھا جو تم نہیں جانتے تھے)

مکہ میں خفیہ مسلم سوسائٹیاں:

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس میں کیا حکمت ہے۔ اگر تم لڑتے تو تمہارا اپنا ہی نقصان ہوتا۔ یعنی تمہاری اپنی پارٹی کے آدمی مارے جاتے۔ تمہیں ان کی خبر بھی نہ ہوتی۔

رسول اللہ ﷺ کو خبر دینے والی خفیہ سوسائٹیاں مکہ میں موجود تھیں۔ انہی کے زور پر مکہ فتح ہوا۔ اگر اب لڑائی ہو جاتی تو وہ پس جاتے۔ ان کی نجات کا ذریعہ سوچ کر لڑائی ہونی چاہئے تھی۔ صلح کے بعد قریب قریب سب لوگ نکل آئیں گے۔ اور مدینہ پہنچ جائیں گے، یا اپنا کوئی اور انتظام کرلیں گے۔ اس لڑائی میں اچانک نہیں پسیں گے۔

اگر وہ پس جاتے تو مسلمان اپنے ہاتھوں اپنی طاقت برباد کرنے والے ہوتے۔ یہ چیز اللہ جانتا ہے۔ عام مسلمان اس بات سے بے خبر تھے۔

(ج) فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿٢٧﴾

(پھر مقرر کر دی اس سے ورے ایک نزدیکی فتح) "نزدیکی فتح" سے خیبر کی فتح مراد ہے۔

(٢٨) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٢٨﴾

(وہی ہے جس نے اپنے رسول کو سیدھی راہ اور سچا دین دے کر بھیجا کہ اس دین کو ہر ایک دین پر غالب کردے اور اللہ حق ثابت کر دینے کے لئے کافی ہے)

قرآن کا مقصد:

جس طرح حدیبیہ، خیبر اور فتح مکہ کے واقعات ہیں، ان کی جزئیات (Detail) کو یاد رکھو اور ان کے مطابق تمام دنیا پر غلبہ حاصل کرو۔ اس قسم کے ضبط اور ایثار والی جماعت ہی غلبہ حاصل کر سکتی ہے۔، خداوند تعالیٰ اس بات

کی گواہی دیتا ہے کہ تم ہی غالب رہو گے۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے اسے صحیح ثابت کر دیا۔

هُدَىٰ۔ دین کی اصل روح اور حکمت۔

دِيْنِ الْحَقِّ۔ سچا دین جو دائمی قانون پر مشتمل ہے۔ کیونکہ وہ انسانیت کے اصلی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ اس دین (قرآن) کو باقی تمام دینوں پر غالب کرنا ضروری ہے اور اسے ہمیشہ غالب رہنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ پہلے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں غالب آیا پھر قیامت سے پہلے غالب آجائے گا اور غلبے سے محض علمی غلبہ بھی مراد نہیں ہے، بلکہ سیاسی غلبہ بھی اس میں شامل ہے یعنی قرآنی قانون، قانون کی حیثیت سے بھی ہمیشہ غالب اور نافذ رہے اور علمی لحاظ سے بھی ہر ایک دین پر فوقیت حاصل رہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا خیال رکھیں۔ اگر مسلمان اس صورت کو اپنی سیاست کی بنیاد بنالیں تو یہ ساری دنیا میں کام کرنے کے لئے کافی ہے۔

امام شاہ ولی اللہؒ کے خیالات:

اس آیت کی تفسیر میں حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

''دین حق خود آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں باقی تمام دینوں پر کلی طور پر غالب نہیں آیا۔ کیونکہ ابھی نصاریٰ اور مجوس اپنے طمطراق کے ساتھ قائم تھے۔ اس لئے عام مفسرین اس آیت کی تفسیر سے عاجز رہے۔ چنانچہ ضحاک کہتے ہیں کہ یہ حضرت عیسیٰ کے نزول کے وقت ہوگا۔ حسن بن فضل کا قول ہے کہ ''واضح دلائل سے غالب کرنا'' مراد ہے۔ البتہ امام شافعیؒ نے ان سب لوگوں سے زیادہ مضبوط بات پیش فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

''خدا نے اپنے رسول کو تمام دینوں پر غلبہ دیا جس نے سنا اسے یقین ہوگیا کہ یہ دین سچا ہے۔ اور اس کے خلاف جو کوئی بھی ہے وہ باطل پر ہے۔ دنیا میں شرک کا مجمع دو ہی دینوں میں ہے اہل کتاب کے دین میں اور امیوں کے دین میں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے امیوں پر غلبہ پالیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے تابع ہوگئے اور بعض اہل کتاب نے مغلوب ہو کر جزیہ دینا قبول کر لیا۔ اور ان پر اس دین کا قانون نافذ ہوگیا۔ تمام دینوں پر اس دین کے غلبے کے یہی معنی ہیں۔''

فقیر عرض پرداز ہے کہ [1] ---۔ ان سب صحیح احادیث کا لب لباب یہ نکلا کہ دین کا کامل غلبہ آنحضرت ﷺ کے بعد ہوگا۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں زمین کی حکومت دو بادشاہوں کے درمیان بٹی ہوئی تھی جو بہت شان و

---

[1] یہاں حضرت امام نے بہت سی احادیث نقل کی ہیں جن کی مدد سے آپ اظہار دین (غلبہ دین) کے معنی معین کرنا چاہتے ہیں ہم نے بات مختصر کرنے کی غرض سے وہ حدیثیں چھوڑ دی ہیں۔ اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائی جائیں۔ (مرتب)

شوکت والے تھے۔
(۱) کسریٰ ایران
(۲) قیصر روم

ان دونوں بادشاہوں کے دین دوسرے دینوں پر غالب تھے، اور ان دونوں دینوں کا اباحت[1] کی طرف میلان تھا اور عقیدہ ارجاء[2] دونوں پر غالب تھا۔ خود کسریٰ اور قیصر بھی ان دینوں کے حامی تھے اور ان کے امراء اس قاعدے کے مطابق کہ الناس علی دین ملوکھم (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) اپنی باتوں اور اپنے کاموں میں انہی کی طرف مائل تھے۔ چنانچہ قیصر کے اتباع میں روم، روس، جرمنی، افریقہ، شام، مصر یعنی مغربی ممالک اور حبشہ نصرانیت کے پیرو تھے۔ اور خراساں، توران، ترکستان، زادلستان اور باختر وغیرہ کسریٰ کے اتباع میں مجوس تھے اور یہودیت، مشرکوں کا دین، ہندوؤں کا دھرم اور صابیوں کا مذہب ان دونوں بادشاہوں کے دبدبے کے نیچے تھے اور کمزور ہو کر ان کے مطیع ہو چکے تھے۔ پس ظہور دین اسلام اور کافروں اور قانون شکنوں کو برباد کرنے کے داعیہ نے کسریٰ و قیصر کی حکومتوں کو برباد کرنے کی شکل اختیار کی۔ کیونکہ جب یہ دونوں حکومتیں برباد ہو جائیں گی سب سے بڑے اور سب سے مشہور دین شکست کھا جائیں گے۔" (ازالۃ الخفا مقصد اول ص ۴۳)

اس کے بعد ہر زمانے میں اس قانون کو غالب رکھنا مسلمانوں کا فرض ہے۔

(۲۹) (۱) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ، (محمد رسول اللہ اور اس کے ساتھی)

نبی اکرمؐ کی اجتماعی حیثیت

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک اجتماعی تحریک ہے۔ اکیلے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا کام نہیں ہے۔ وہ مزمل۔ رفقاء کار جمع کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اور ان کے مشورے سے کام کرتے ہیں۔ ان کی نبوت کی حیثیت جداگانہ، مستقل حیثیت ہے۔ اس میں ان کا کوئی شریک نہیں اور نہ ان کا کوئی مشیر ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت نبی اکرمؐ کی اس اجتماعی حیثیت کی طرف جابجا اشارے موجود ہیں۔ مثلاً

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ (آل عمران ۱۹۵)
(جن لوگوں کو گھر بار سے ہجرت کرنی پڑی اور جن کو اپنے وطن سے نکالا گیا)

---

[1] کھانے پینے اور نکاح کے معاملے میں کسی قاعدے کی پابندی نہ کرنا اور ہر چیز کو جائز سمجھنا (مرتب)
[2] یہ عقیدہ کہ جو چاہو کرو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے بخش دے گا۔ (مرتب)

ظاہر ہے کہ وہ تنہا حضرت نبی اکرمؐ نہیں تھے، بلکہ آپ اور آپ کے ساتھی سب مراد ہیں۔

يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (انفال ۶۴)

''اے نبی! اللہ تجھے اور تیرے مومن ساتھیوں کے لئے کافی ہے''

اس میں بھی نبی اکرمؐ اور آپ کے ساتھیوں کو ملا کر ایک جماعت ظاہر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

یعنی پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنین سب پر اطمینان قلب نازل فرمایا (توبہ ۲۶)

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸۸

یعنی رسول اور وہ لوگ جو اس کے شریک ایمان ہیں۔ اپنے مال و جان سے اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں۔ جملہ بھلائیاں ان سب کے لئے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

یہاں بھی صحابہ کرام کو رسول کا شریک ایمان یا رفیق فکر اور جہاد میں شریک یعنی رفیق عمل ظاہر کر کے کامیابی کے نمونے کے لئے ساری جماعت کو پیش کیا گیا۔

یہی وہ چیز ہے جسے حضرت نبی اکرمؐ نے اپنی زبان مبارک سے بھی، مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِيْ (جس اصول کار پر میں اور میرے ساتھی ہیں) کے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔

مشورہ کرنا آنحضرتؐ کے لئے ضروری تھا

آپ کی یہی اجتماعی حیثیت ہے جو مشورہ کرنے کے حکم کو قبول کر سکتی ہے، جس کا ذکر قرآن حکیم میں ان لفظوں میں آیا ہے؛

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران ۱۵۹)

(ان سے معاملات ملی میں مشورہ (ضرور) لیا کرو۔ اور جب پختہ ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو)

امام ابو بکر جصاص الرازی الحنفی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ :

''حضرت نبی اکرمؐ پر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا لازم تھا۔ دینی امور میں بھی اور ان امور میں بھی جن کے متعلق خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی صریح حکم موجود نہ تھا۔ اور دنیاوی امور میں بھی۔ یہ غلط کہا جاتا ہے کہ یہ مشاورت محض ان کا جی خوش کرنے اور ان کی قدر بڑھانے کے لئے تھی اور اس لئے بھی کہ آپ کی امت اسی طرح کرے۔ کیونکہ جب کسی کو معلوم ہو کہ مجھ سے جس امر کے متعلق مشورہ لیا جا رہا ہے اور جس بارے میں صحیح رائے

پوچھی جارہی ہے اس کے متعلق میں نے ایک مشورہ اپنی پوری کوشش سے پیدا بھی کرلیا۔ یا سوچ بچار کرکے کوئی صحیح رائے قائم کرلی تو بھی اس پر عمل نہ کیا جائے گا اور نہ اسے قبول کیا جائے گا۔ تو بھلا اس مشاورت سے اس کا جی کیا خوش ہو سکتا ہے اور اس کی قدر کیا بڑھ سکتی ہے؟ بلکہ اس کا اثر الٹا یہ ہوگا کہ ایسے مشورہ لینے والے سے وحشت بڑھے گی۔ کیونکہ اسے علم ہوگا کہ میری رائے نہ کسی کو سننی ہے اور نہ اس پر عمل کرنا ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :

"نبیؐ کے لئے ضروری تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں سے ان معاملات میں مشورہ کرتے جن میں کوئی صریح حکم موجود نہ تھا۔ البتہ صریح احکام کے بارے میں مشورہ ناجائز تھا۔ مثلاً یہ پوچھنا کہ نماز ظہر یا عصر کے بارے میں یا زکواۃ یا روزے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ بالکل غیر ضروری تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مشورے کا حکم دیتے وقت یہ نہیں کہا کہ فلاں بات میں مشورہ کرو اور فلاں میں نہ کرو۔ اس لئے لازم تھا کہ ہر دو معاملات میں صحابہ کرام سے مشورہ لیتے"۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :

"عزیمت (پختہ ارادہ) کا ذکر مشاورت کے بعد آیا[1] ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں وہ عزیمت مراد ہے جو مشاورت سے پیدا ہو۔" (احکام القرآن جلد دوم ص ۴۱ طبع بیروت)

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت کے مطابق آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ (مشاورت اھل الرأی ثُم اتباعُھُم) یعنی جو لوگ مشورہ دینے کے قابل ہوں، ان سے رائے لے کر ان کی رائے کی پیروی کرنے کا نام عزم ہے۔

مشاورت کی اہمیت :

لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے عام طور پر حضرت نبی اکرم ﷺ کے اس بلند اجتماعی تصور کو آپ ﷺ کی انفرادیت میں گم کردیا۔

مشاورت کا مسئلہ اسلام میں بہت بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن اسلامی حکومتوں کو مشورے سے خالی کرکے مطلق العنان، جاہل حکمرانوں اور امیروں کا کھیل بنادیا گیا۔ وہ مسلمانوں کی امانت (سرکاری خزانے) سے اپنی شہوت پرستیوں پر

---

[1] الفاظ کی ترتیب یوں ہے: وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ ظاہر ہے کہ اس میں شاورھم (ان سے مشورہ لیا کر) پہلے واقع ہوا ہے اور (فاذا عزمت جب تو پختہ ارادہ کرے) بعد میں آیا ہے۔ (مرتب)

روپیہ صرف کرتے ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی مصلحت کے مقابلے میں خیانتیں کرتے ہیں اور ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس قسم کی غلطیوں کا خمیازہ مسلمانوں کو صرف اس غلط تفسیر کی وجہ سے بھگتنا پڑا۔ ورنہ ہر ایک مسلمان ایک حاکم کے اوپر ننگی تلوار ہے۔ وہ حاکم کیوں قانون الٰہی کی اطاعت نہیں کرتا؟ اگر وہ اطاعت نہیں کرتا تو کس بنا پر ہم سے اطاعت کا طلبگار ہوتا ہے؟ یہ طاقت مسلمانوں میں پھر سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس سے ان کی جماعتی زندگی آسانی کے ساتھ قرآن کے مطابق بن سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شوریٰ کو مستحب [1] کا درجہ دیکر اسے سیاست اسلامی سے نکال ڈالنے والے لوگوں نے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔

صحابی سے کون مراد ہیں؟ :

ایسے ہی صحابی کی وہ تعریف عوام میں مشہور ہوگئی ہے جس سے بہت غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ صحابی کی یہ تعریف کہ اس نے ایمان کی حالت میں رسول اللہؐ کو دیکھا ہو حدیث کی روایتیں جمع کرنے کی خاطر بنائی گئی ہے۔ ورنہ اصل میں سیرت نبوی کے اعتبار سے صحابی وہ ہے جس نے آپ کی معیت لازم پکڑی اور آپ کے ساتھ آخر تک انقلاب میں شریک رہا۔ تکلیفیں اٹھائیں اور اس تحریک کی صداقت کے متعلق پورے یقین کے ساتھ یہ اطمینان کر لیا کہ انسانیت کے لئے اس کے سوا اور کوئی پروگرام نہیں ہے۔ [2]

(۲) اور اسی پر پورا اترنے والے وہ لوگ ہیں جن کی تعریف قرآن حکیم ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ (انفال: ۷۴)

(یعنی جو لوگ ایمان لائے جنہوں نے اپنے گھر چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جن لوگوں نے انہیں جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان، ان کے لئے بخشش ہے اور عزت کی روزی ہے)

---

[1] مستحب وہ امر ہے کہ اس پر عمل کریں تو اچھا ہے اور نہ کریں تو کوئی ہرج بھی نہیں (مرتب)

[2] چنانچہ محدث مازری شرح برہان میں رقمطراز ہیں کہ :

لسنا نعنی بقولنا "الصحابہ عدول" کل من راہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما ما، او زراہ لماما، او اجتمع بہ لغرض و انصرف مکثا انما نعنی بہ الذین لازموہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولائک ہم المفلحون) منقول از اسوہ صحابہ از مولانا محمد سعید انصاری جلد اول ص بحوالہ "فتح المغیث" ص ۳۷۷) یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ الصحابۃ عدول (صحابی سب عادل ہیں) تو اس سے ہماری مراد ہر وہ شخص نہیں جس نے آنحضرتؐ کو کسی روز دیکھ لیا یا کبھی زیارت کرگیا۔ یا کسی کام سے آیا اور فوراً واپس لوٹ گیا۔ بلکہ ہماری مراد ان بزرگوں سے ہے جنہوں نے آپ کی معیت لازم پکڑی، جہاد میں آپ کی مدد کی۔ آپ کی حمایت میں آپ کے دشمنوں سے لڑے۔ اور اس نور کی پیروی کی جو آپ پر نازل ہوا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقی معنوں میں کامیاب ہوئے۔ (مرتب)

رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کی جنہوں نے آپ ﷺ کی سیرت (حالات زندگی) کے بنانے میں حصہ لیا چند صفتیں ہیں۔

(۱) اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ (کافروں پر سخت)

نبی ﷺ کے ساتھی اشداءُ علی الکفار ہیں:

ان کی سختی کے دو پہلو ہیں: (۱) یہ لوگ مخالفوں سے لڑنے میں بڑے سخت ہیں۔ کہ موت قبول کر کے لڑنے کے لئے جاتے ہیں۔ (۲) جو لوگ اس تحریک کے کھلم کھلا دشمن (کافر) ہیں۔ یہ لوگ ان کافروں کو انتہائی سزا دینے کے طرفدار ہیں۔ قتل کی ضرورت ہو تو قتل کر دئے جائیں۔[1] ورنہ جو اس سے کم سزا ضروری ہو وہ دی جائے۔

قتل ہمیشہ اسی وقت کیا جائے گا جب انہوں نے قتل کیا ہو یا وہ لڑنے کے لیے تیار ہوئے ہوں۔ ورنہ ان کی انتہائی سزا یہ ہے کہ ان کی سیاسی تحریک روک دی جائے اور انہیں سیاست میں حصہ نہ لینے دیا جائے۔ ان کی عقلمندی سے جو ارتقاقی اور تمدنی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، ان سے جماعت کو محروم کرنا مقصود نہیں ہے۔

(۲) رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (آپس میں رحمدل)

وہ "رحماءُ بینھم" بھی ہیں:

جو لوگ اس تحریک کی تائید میں ان کے ساتھی ہیں ان کے لئے ان کے پاس سوائے رحمت کے اور کچھ نہیں۔ جیسے ماں باپ اپنی اولاد پر رحمت کرتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رحمت سے پیش آتے ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے بھی رحمت کے دروازے کھولتے ہیں جس شخص کے متعلق امکان نظر آتا ہے کہ وہ اس تحریک کی تائید کرے گا اسے مخالف بننے کا موقعہ نہیں دیتے۔

ان کے جو ساتھی مظلوم اور ضعیف ہیں۔ اگرچہ یہ انہیں پہنچانتے بھی نہیں۔ مگر ان پر رحم کرنے کے لئے اپنی تمام عزت قربان کر دیتے ہیں۔ جیسے انہوں نے حدیبیہ کی صلح میں کیا۔ یا حضرت فاروق اعظم نے عراق کی زمین فوجیوں میں تقسیم کرنے سے اس بناء پر انکار کر دیا تھا کہ ان اراضی کا فائدہ بعد میں آنے والی نسلوں کو ملنا چاہئے۔

(ازالۃ الخفا: امام ولی اللہ دہلوی مقصد دوم ص ۱۲۷)

---

[1] جنگ بدر میں جو کافر قیدی گرفتار ہو کر آئے حضرت عمرؓ نے ان کے متعلق تجویز کیا کہ ہر ایک مسلمان ان میں سے اپنے اپنے عزیزوں کو قتل کر دے۔ (مرتب)

فائدہ: یہ ایک طبعی چیز ہے کہ اگر کسی جماعت میں مخالف جماعت کے خلاف دشمنی کے جذبات پیدا کر دئے جائیں، تو خود اس جماعت کے اندر محبت و رحمت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو جماعت قرآن حکیم کو تمام دینوں پر غالب کرنے کے لئے اٹھے، اسے اپنے اندر انتہا درجے کی محبت و رحمت پیدا کرنی چاہئے۔ اور اس آپس کی محبت کے جو تقاضے ہیں وہ پورے کرنے چاہئیں۔ یعنی آپس میں کامل تعاون اور ایک دوسرے کی ضروریات کی کفالت۔

(۳) تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (تو دیکھتا ہے، انہیں رکوع میں اور سجدے میں)

خدا پرست لوگوں کی اصطلاح میں رکوع اور سجدہ، خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا مظاہرہ ہے۔

رکوع کیا ہے:

رکوع کا مطلب یہ سمجھنا چاہئے کہ ذمہ داری کا جو بوجھ اللہ نے ہم پر ڈالا ہے ہم اسے برداشت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو جو دل و دماغ دیتا ہے اسی نسبت سے اس پر فرض عائد کرتا ہے۔ یہ فرض اس پر ایک بوجھ ہے جسے وہ رکوع کی شکل میں اٹھاتا ہے۔ گویا وہ اقرار کرتا ہے کہ میری جو ڈیوٹی مقرر کی گئی ہے میں اسے خوشی کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔ اور اس پر اسی طرح کاربند رہوں گا۔ جیسے ایک حیوان ایک انسان کے آگے اپنا فرض ادا کرتا ہے۔

سجدہ کیا ہے؟:

سجدہ یہ ہے کہ میں کامل اطاعت کا اعلان کرتا ہوں۔ پہلا سجدہ کر کے اعتراف کرتا ہوں کہ میری جان تیری راہ میں حاضر ہے۔ دوسرے سجدے کے ذریعے اس امر کا اعتراف مقصود ہے کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق میری جان کے ساتھ ہے۔ مال و اولاد۔۔۔ سب کچھ تیری راہ میں قربان کرتا ہوں۔ یہ تکمیلی درجہ ہے۔ اور اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ [1] (التوبہ: ۱۱۱) کی عملی تفسیر ہے۔

جو انسان اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہا وہ انسانیت سے گر گیا۔ اگر اس نے اپنا فرض پورا ادا کر دیا تو وہ تعریف کے قابل ہے۔ یہ رکوع کی تکمیل ہے لیکن ایک شخص اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے فرض سے بھی زیادہ کام کرتا ہے، وہ جان و مال اور سب کچھ مکمل طور پر اس انقلاب میں جھونک دیتا ہے یہ سجدہ ہے۔

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۴۸: ۲۹) (تو انہیں رکوع اور سجدہ میں دیکھتا ہے) سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھی اپنے کام میں غرق ہیں۔ وہ اس کی تکمیل کے بغیر دم نہیں لیں گے۔ اور اسے انتہا تک پورا کریں

---

[1] بیشک اللہ نے مومنوں کے جان و مال مول لے لئے ہیں۔

گے وہ اس کی تکمیل پر جان و مال سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں۔

اسی آمادگی اور عمل کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی آخری زندگی میں یہ آیت نازل ہوئی کہ :

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (۵ : ۳)

(میں نے آج تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی)

بقول امام ولی اللہ دہلویؒ اتمام نعمت سے مراد بین الاقوامی حکومت دینا ہے۔ یہ درخت قیامت تک پھل لاتا رہے گا۔

(۴) يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ (وہ اللہ سے فضل مانگتے ہیں)

فضل کیا ہے؟ :

اگر وہ محض فرض ادا کرتے تو وہ اپنا حق پورا پاتے۔ مگر وہ زیادہ ترقی چاہتے ہیں۔ اس لئے تکمیلی کام بھی کرتے ہیں۔ وہ اس فضل کی وجہ سے قوموں کی دوڑ میں اتنا آگے بڑھ جائیں گے، کہ وہ سب کے امام مان لئے جائیں گے، اس لئے انہیں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ :

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ (الفرقان : ۷۴)

(بال بچے ایسے ہوں کہ ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ یعنی اپنے گھر میں جو پروگرام چلانا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں پورا ہوتا نظر آئے جس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ خدا سے ڈر کر انصاف کرنے والے متقیوں کے امام بنیں)

(۵) وَ رِضْوَانًا (اور اللہ کی رضا)

رضوان سے کیا مراد ہے؟ :

اللہ کی رضا اس کی تجلی میں محویت سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نے انسان کے کمالات کے دو حصے کر دیئے ہیں :

(۱) ارتفاق، یعنی دنیا میں آرام سے زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ

(۲) اقتراب، یعنی قرب الٰہی میں ترقی کرنا یا دوسرے لفظوں میں حظیرۃ القدس میں مقام حاصل کرنا۔

رضوان کا تعلق اقتراب سے ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے قلب میں ایک آئینہ ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی تجلی کا عکس آتا ہے۔ اس آئینے کو جتنا زیادہ صاف کیا جائے اتنا ہی یہ عکس زیادہ روشن اور صاف آئے گا۔ اس تجلی کا جو نزول انسان کے قلب میں ہوتا ہے، اسے قرب الٰہی (اقتراب) سمجھنا چاہئے۔ اور تجلی کا نازل ہونا ہی اللہ کی خوشنودی (رضوان) کی علامت ہے۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انسان اس دنیا میں رہتا ہوا، "ملاء اعلیٰ" کے ساتھ تعلق قائم کرلیتا ہے۔ اور وہ اللہ کی شانوں کا ہر وقت احساس کرتا رہتا ہے اور جامد نہیں ہو جاتا۔ صالح انقلابی ذہنیت کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے ایسا انقلابی مرنے کے بعد حظیرۃ القدس میں جگہ پاتا ہے۔

اللہ کا فضل انسان کی ارتفاقی زندگی کا انتہائی درجہ ہے۔

اللہ کا رضوان انسان کی اقترابی زندگی یعنی اللہ کا قرب اور نزدیکی حاصل کرنے کا آخری درجہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی جماعت کی خوبی

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ، (محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی) سے جو جماعت پیدا ہوئی ہے اس کی زندگی ارتفاق اور اقتراب دونوں کے لحاظ سے نمونے کی زندگی ہے۔ انہوں نے بین الاقوامی حکومت بھی پیدا کی اور قرب الٰہی کے بھی اونچے سے اونچے درجوں تک پہنچے۔ ان کا یہ کارنامہ قیامت تک کے انقلابیوں کے لئے اعلیٰ درجے کا نمونہ ثابت ہوگا۔ بیچ میں اس نمونے پر اور نمونے ڈھلتے رہیں گے۔ لیکن اصل نمونہ یہی ہوگا۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نمونے کے اس اولین دور کو حضرت عثمانؓ کی شہادت پر ختم مانتے ہیں۔

اور اس دور کی تاریخ کے جس اعلیٰ پائے کے وہ شرح کرنے والے ہیں، اس سے بہتر کوئی دوسرا عالم نہیں مل سکتا۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کا قانون بین الاقوامی درجے پر غالب رہنا چاہئے۔ یہ جماعت اپنے فیصلے سے اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہے۔ یبتغون (چاہتے ہیں) سے یہی مراد ہے کہ اپنی مرضی اور فیصلے سے ''چاہتے ہیں''۔

(۶) سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (ان کی نشانی ان کے موہنوں پر ہے سجدے کے اثر سے)

سجدے کی روح۔۔۔۔۔ قربانی۔۔۔۔۔ ان کے اندر داخل ہو چکی ہے اور اس سے وہ اس قدر نڈر ہو چکے ہیں کہ ان کے چہرے سے ایک نور ابلتا ہے۔ وہ ہر ایک مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ انہیں راہ حق سے کوئی مصیبت ہٹا نہیں سکتی۔

(۷) ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ (ان کی یہ تمثیل تورات میں (پہلے ہی) بیان کردی گئی ہے۔)

تورات اور انجیل میں اس جماعت کا ذکر :

تورات میں اس کا اشارہ مجمل ہے۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ میں بنی اسماعیل کو اتنا ہی بڑھاؤں گا جتنا بنی اسحاق کو۔ میں انہیں ایک بڑی قوم بناؤں گا۔

(۸) وَمَثَلُهُمْ فِى الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (اور انجیل میں ان کی تمثیل، جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا، پھر اس کی کمر مضبوط کی۔ پھر وہ موٹا ہوا پھر کھڑا ہو گیا اپنی نال پر۔ خوش لگتا ہے کھیتی والوں کو)

اس سلسلے میں انجیل کے مندرجہ ذیل مقامات لائق توجہ ہیں :

انجیل مرقس باب ۴ آیات ۳۔۹ میں ہے کہ :

''سنو، دیکھو، ایک بونے والا بیج بونے نکلا اور بوتے وقت ایسا ہوا کہ کچھ راہ کے کنارے گرا اور پرندوں نے آکر اسے چگ لیا۔ اور کچھ پتھریلی زمین پر گرا جہاں اسے بہت مٹی نہ ملی، اور گہری مٹی نہ ملنے کے سبب جلد اگ آیا۔ اور جب سورج نکلا تو جل گیا اور جڑ نہ ہونے کے سبب سوکھ گیا۔ اور کچھ جھاڑیوں میں گرا۔ اور جھاڑیوں نے بڑھ کر اسے دبالیا۔ اور وہ پھل نہ لایا۔ اور کچھ اچھی زمین پر گرا۔ وہ اگا اور بڑھکر پھلا اور کوئی تیس گنا کوئی ساٹھ گنا کوئی سو گنا پھل لایا''۔

پھل لانے کی مزید کیفیت آگے چل کر آیات ۲۶، ۲۷، ۲۸ میں اس طرح بیان کی گئی ہے :

اور اس نے کہا: خدا کی بادشاہت ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے، اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے، اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے، زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے، پہلے پتی، پھر بالیں، بعد اس کے بالوں میں تیار دانے''

(۹) لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ (تاکہ ان سے کافروں کا جی جلائے)

خدا نے قوموں کو رسولوں کے ذریعے سے اپنی کتابیں اور ہدایتیں دیں۔ وہ لوگ اس دین کی عزت کرتے اور اپنی کتاب پر عمل کرتے تو ان کی عزت قائم رہتی اور ان پر کوئی دوسرا حاکم نہ ہو سکتا، مگر انہوں نے ان کتابوں کی عزت نہ کی اور اپنے دین کا احترام قائم نہ رکھا۔ بلکہ اس کی عملاً مخالفت کی، یہ کفار ہیں۔

اب ایک دیندار جماعت پیدا ہوتی ہے جو ان پر غالب آجاتی ہے۔ کفار اپنے آپ کو بھی دیندار سمجھتے ہیں۔ انہیں غصہ آتا ہے کہ یہ لوگ ہمارے دین پر غالب کیوں آگئے؟ لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ یہ باعمل جماعت جو مرنے پر آمادہ ہے۔ ان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والوں یا نیم دلی سے اپنے دین کے ماننے والوں پر غالب آجائے۔

ان نام نہاد ''دیندار'' قوموں کو مغلوب کرنا ایک دن کا کام نہیں ہے۔ یہ انقلاب قیامت تک جاری رہے گا۔

کیا مہاجرین کی پہلی جماعت کے ذریعے ہندوستان، ترکستان اور سوڈان فتح ہو سکتے تھے؟ پس قرآنی تحریک کی ترقی ایسی ہے، جیسے کھیتی کا نشوونما پانا۔ یہ چھو منتر کا کام نہیں ہے۔ ارتقائی کام ہے۔ یہ طبعی چیز ہے ہو کر رہے گی۔ مگر بعض لوگ جن کی نظر قرآن پر گہری نہیں ہے طبعی رفتار کو دین سے الگ کرتے ہیں، لیکن ہم امام ولی اللہ کے واسطے سے نیچر اور دین کو ایک ہی چیز مانتے ہیں۔ یہ تحریک اس کی مثال ہے یعنی جس طرح بیج بونے کے بعد کھیتی طبعی رفتار سے ترقی کرتی ہے۔ ایسے ہی یہ قرآنی تحریک طبعی طور پر ترقی کرے گی۔ اور تمام دنیا پر چھا جائے گی۔

یہاں تک حضرت نبی اکرم ﷺ کی جماعت کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو ان کی کامیابی کے کفیل بنے۔ اب ایک کُلیے کے طور پر جامع اصول بیان کیا جاتا ہے۔

(۱۰) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۔ (ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔ ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں معافی ملے گی اور بڑا اجر ملے گا)

یہ نمونے کی جماعت ہے :

اس انٹرنیشنل تحریک کو چلانے والی جتنی جماعتیں ہیں۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ ان سب سے وعدہ ہے کہ ان کی غلطیاں معاف کردی جائیں گی۔ بشرطیکہ وہ اس پروگرام پر چلتی رہیں۔ وہ اس تحریک سے بڑے بڑے فائدے حاصل کریں گے۔ اِس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی۔

رسول اللہ کی جماعتی کامیابی جو نمونے کے طور پر قرآن کی عملی زندگی پیش کرتی ہے وہ سورہ فتح کی آخری آیت میں ضبط کردی گئی ہے۔ اس نمونے پر قیامت تک عمل کرنا ہوگا۔ اب قرآن شریف کو کسی اور نمونے کی ضرورت نہیں ہوگی اور نہ انسانیت کو کسی اور کتاب الٰہی کی حاجت ہوگی۔ تمام مسلمانوں پر ایسی جماعت کا قائم رکھنا فرض ہے۔

سورۂ فتح کا خلاصہ اور سورۂ حجرات کے ساتھ ربط

سورۂ فتح کا خلاصہ :

سورۂ فتح میں قرآن حکیم کے عظیم الشان نصب العین کا اعلان کیا گیا ہے۔ جس کا منشاء یہ ہے کہ قرآن حکیم کا قانون تمام دوسرے قانونوں پر غالب رہنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ نصب العین قرآن حکیم کے بین الاقوامی غلبے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس صورت میں آنے والی بین الاقوامی جنگوں کی طرف بھی صاف الفاظ میں اشارہ

کر دیا گیا ہے۔ پھر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ قومی انقلاب کی تکمیل کے بغیر کوئی بین الاقوامی انقلاب سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ اور قومی اور بین الاقوامی انقلابوں کے لئے نہایت اعلیٰ درجے کے ضبط کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس سورت میں اس قسم کے ضبط کی حد یہ بیان کی گئی ہے کہ جو شخص قرآن حکیم کی انقلابی جماعت میں شامل ہو کر اس کے کسی حکم کو ماننے سے انکار کر دے، اسے سخت سے سخت سزا دی جاسکتی ہے، یہاں تک کہ آخری حالت میں موت کی سزا بھی مل سکتی ہے۔ پھر اس قانون کے ماننے والوں کی حالت بھی یہ بیان کردی ہے کہ وہ ان لوگوں پر بڑی سے بڑی سختی کرنے کو تیار ہیں، جو اس قانون کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے علانیہ میدان جنگ میں اتر آئیں۔

اس قسم کی نئی جماعت جب فاتح ہو کر پرانے رجعت پسندی کے دور کو ختم کر دینا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی میں نئی تہذیب کی بنیاد رکھے۔ وہ نئی تہذیب اس نئے نظام کی پوری طرح مناسب ہوتی ہے۔ جب سوسائٹی اس نئی تہذیب میں پرورش پانے کی عادی ہو جاتی ہے تو اسے نئے نظام پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر فقط حکومت میں تبدیلی پیدا کی جائے اور تہذیب پہلی ہی قائم رکھی جائے تو چند دنوں کے بعد ویسی ہی رجعت پسند جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے انقلابی جماعت رجعت پسندی کا دور ختم کرنے کے لئے عموماً نیا مرکزی شہر بساتی ہے جس میں نئی تہذیب منظّم کی جاتی ہے۔

اسلام کی سیاسی قوت فتح مکہ کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور مکہ حجاز کا پرانا مرکز تھا۔ نئی تہذیب کے لئے ایک نئے مرکز کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے واسطے مدینہ طیبہ میں رہنا آسان کر دیا۔ مدینہ منورہ کی حالت شروع میں شہر کی نہ تھی۔ وہ چند بستیوں کا مجموعہ تھا۔ جن میں نصاریٰ و یہود کے قبیلے بستے تھے۔ انہی میں بنی نجار کی بستی تھی جس میں حضرت نبی اکرم ﷺ نے مسجد بنائی۔ اور اس مسجد اور بستی کو نئی تہذیب کا منبع بنایا۔

سورہ حجرات کے ساتھ ربط :

اس نئی سوسائٹی کی تہذیب جن قاعدوں پر چلے گی ان کا ذکر سورۂ حجرات میں آتا ہے۔